مولانا فضلِ حق خیر آبادیؒ
ایک تحقیقی مُطالعہ
افضل حق قرشی

مولانا فضل حق خیرآبادی

ایک تحقیقی مطالعہ

مرتبہ

افضل حق قرشی

سالِ اشاعت ـــــــ اگست ۱۹۹۲ء
مرتّب ـــــــ افضل حق قرشی
پبلشر ـــــــ محمد فیصل
پرنٹرز ـــــــ زاہد بشیر۔ لاہور
قیمت ـــــــ ۷۵ روپے

فہرست

انتساب

والد بزرگوار کے نام

(۱)

مولانا فضل حق خیر آبادی (۱۷۹۷ء — ۱۸۶۱ء) ایک جید عالم تھے۔ معقولات میں تو مسلم ہندوستان کے عہدِ آخر کے امام مانے جاتے ہیں۔ عربی و فارسی زبان کے ممتاز ادیب اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو جنگِ آزادی میں شرکت بھی بتایا جاتا ہے۔

اس فضیلت و مرتبت کے باوجود ابھی تک ان کی کوئی جامع سوانح مرتب نہیں کی گئی۔ اس خلا کو ہم نے اس مجموعۂ مقالات سے پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا کی زندگی کا غالب حصہ (۱۸۱۵ / ۱۶ء — ۱۸۵۷ء) مختلف حیثیتوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیسی ریاستوں کی ملازمت میں بسر ہوا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا مقالہ سوانح فضل حق کے اسی حصے پر محیط ہے۔ انھوں نے کمال محنت اور تحقیق سے جزئیات تک مہیا کی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مولانا کی علمی مصروفیات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

جنگِ آزادی میں شرکت مولانا کی زندگی کا دوسرا پہلو ہے۔ اس ضمن میں ان سے متعلق غلط باتیں مشہور رہی ہیں۔ بقول مالک رام:

> "دراصل یہ نتیجہ تھیں ہماری اس خواہش کا کہ ہم انہیں نہ صرف بزم علم و عقل اور مجلس قال اقول ہی میں صدر نشیں، بلکہ جنگ آزادی میں بھی برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر اتفاق سے بعض غیر محتاط بلکہ غلط روایات نے ہماری اس خواہش کی تکمیل کے لیے سامان بھی فراہم کر دیا اور ہم نے بے جھجک انہیں تسلیم کر لیا۔"

مولانا امتیاز علی عرشی اور جناب مالک رام کے مقالات میں دستاویزی شہادتوں کی بنیاد پر پہلی بار ان اغلاط العامہ کی تردید کی گئی ہے۔ عرشی صاحب کے مقالے کی اساس رضا لائبریری

رام پور میں محفوظ، نواب یوسف علی خاں کے نام مولانا فضل حق کے ایک نجی خط پر ہے اور مالک رام صاحب کا مقالہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی میں محفوظ مولانا کے مقدمے کی فائل پر بنیاد رکھتا ہے۔

امید ہے کہ اس مجموعہ سے فضل حق شناسی میں مدد ملے گی۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

مولانا فضلِ حق خیرآبادی

دورِ ملازمت

مولانا فضل حق خیرآبادی نامور عالم و فاضل، معقولات کے امام، مصنفِ شہیر اور عربی کے مسلم الثبوت شاعر و ادیب تھے۔ فارسی زبان و ادب پر گہری نظر تھی۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بھی وسیع تھا جس میں اس دور کے مشہور علماء شامل تھے۔ ان کے صاحبزادے شمس العلما مولانا عبدالحق صدر نشین اصحاب علم و فضل تھے۔ خاندان میں علمی روایات متوارث رہیں مگر افسوس کہ مولانا فضل حق کی سیرت و سوانح کے بارے میں ہمیں ان بزرگوں سے تحریری صورت میں کچھ نہ ملا۔ ہم عصر تذکروں میں بہت مختصر ذکر ملتا ہے حکیم بہار الدین گوپاموی (ف ۱۹۶۲ء) نے علمائے سیتاپور کے حالات میں ایک مختصر سا کتابچہ "سیر العلما" ۱۳۴۶ھ میں مرتب کیا جس میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے حالات دو صفحات میں لکھے۔ اس کے بعد مفتی انتظام اللہ شہابی گوپاموی ثم اکبرآبادی (ف ۱۹۶۸ء) نے قلم اٹھایا اور ایک طویل مضمون "مولانا فضل حق و عبدالحق" لکھا جو رسالہ "مصنف" علی گڑھ میں باہتمام سید الطاف علی بریلوی شائع ہوا جس میں

انہوں نے بہت سی نامعتبر باتیں لکھ دیں۔ ان کا یہی مضمون حک و اضافہ کے ساتھ مختلف رسالوں میں شائع ہوتا رہا اور مولانا فضل حق سے متعلق نامعتبر روایات منتقل ہوتی رہیں۔ پھر جس کسی نے مولانا فضل حق پر قلم اٹھایا اس کے ماخذ مفتی انتظام اللہ تھے۔ ۱۹۴۶ء میں مولوی عبدالشاہد خان شروانی نے "باغی ہندوستان" کے عنوان سے مولانا فضل حق کے "رسالہ و قصائد غدریہ" کو شائع کیا۔ اتفاق کی بات کہ مفتی صاحب کا مواد اور ان کے "مفید مشورے" بھی شروانی صاحب کے شاملِ حال رہے اور سوانح حیاتِ فضل حق کے سلسلے میں زیادہ تر مفتی صاحب ہی کا کام شروانی صاحب کے پیشِ نظر رہا۔ البتہ انہوں نے زبان و بیان اور نوک پلک کو درست کر دیا اور حالات میں کچھ اضافہ بھی کیا۔ اس طرح مفتی صاحب کی روایات ان کی کتاب میں شامل رہیں۔

مولانا فضل حق کی زندگی کا آغاز رزیڈنسی دہلی کی ملازمت سے ہوا پھر وہ جھجر، سہارن پور (انگریزی ملازمت)، ٹونک، نواب رام پور — واجد علی شاہ (لکھنؤ) اور راجا الور کے یہاں ملازم رہے۔ فلکِ کج رفتار کی نیرنگی دیکھیے کہ کیسا عالم و فاضل اور کیسی بادیہ پیمائی۔

کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں آخر
جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانا ہوا

یہ ساری داستانِ ملازمت، سوانح حیات فضل حق میں دو چار سطروں میں ادا ہوتی رہی ہے۔ ہم نے اس مضمون میں کوشش کی ہے کہ مولانا فضل حق کے دورِ ملازمت کے سلسلے میں جو واقعات مل سکیں انہیں اہلِ علم و نظر کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں شمالی ہند میں انگریزی اقتدار کو تیزی سے وسعت ہوئی۔ ۱۸۰۱ء میں روہیل کھنڈ کا علاقہ بذریعہ معاہدہ نواب سعادت علی خاں نواب وزیر (اودھ) سے انگریزوں کو مل گیا۔ ۱۸۰۳ء میں دہلی پران کا قبضہ ہوگیا۔ لارڈ لیک نے مرہٹوں کی قوت کو توڑ دیا اور دوآبہ کے اضلاع بھی ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے حاصل کر لیے۔ آہستہ آہستہ انگریزوں کی گرفت نواحِ دہلی کے جاگیرداروں پر سخت ہوتی گئی اور پھر راجپوتانہ کی ریاستوں پر بھی معاہدات وغیرہ کے ذریعے انگریزوں کا تسلط و غلبہ قائم ہوگیا۔

فتح دہلی کے بعد لارڈ ویلزلی یعنی گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے شاہ عالم بادشاہ کے آئندہ گزارے، خاندانِ شاہی کی پرورش اور بادشاہ کے کاروبار لائقہ کے انصرام کے لیے جو لائحہ عمل سوچا گیا، اس کی اطلاع ۲ر جون ۱۸۰۵ء کو کورٹ آف ڈائریکٹرس (لندن) کو دی گئی۔ اس لائحہ عمل کی مندرجہ ذیل دفعات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں[1]:

> "عدالت ہائے انصاف خواہ فوجداری خواہ مذہبی خواہ دیوانی، دہلی اور اس کے متعلقات کے باشندوں کے لیے شرع محمدی کے مطابق قائم ہوں۔ عدالت فوجداری کا کوئی حکم جو قید میعاد کثیر یا سزائے موت پر مشتمل ہو، بغیر مرضی حضور (بادشاہ شاہ عالم) عمل میں نہ لایا جائے اور تمام دعووں اور احکام مقدمہ کی اطلاع ہر روز حضور کو دی جایا کرے۔"

کورٹ آف ڈائریکٹرس وغیرہ کی منظوری سے گزر کر یہ لائحہ عمل ۱۸۰۶ء یا اس کے بعد روبعمل آیا ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ جب دہلی اور اس کے علاقے میں انگریزوں کا عمل دخل پوری طرح ہوگیا تو شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا ہوگا[2]۔

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی (جلد اول) از بشیر الدین احمد (دہلی ۱۹۱۹ء) ص ۶۹۰ [2] بر صفحہ آئندہ

جس کے دوررس نتائج مرتب ہوئے اور ایک طرح سے یہ فتویٰ انگریزی حکومت سے عدم تعاون کا براہِ راست اعلان تھا۔ مسلمانوں نے انگریزی ملازمت کا مقاطعہ کیا اور ان سے معاشرتی روابط کو بھی پسند نہیں کیا۔[۱]

اس صورتِ حال سے انگریزی حکومت فکرمند ہوئی۔ وہ مسلمانوں کے تعاون کی خواہاں تھی، ان کو قریب لانا چاہتی تھی اور اس کی پالیسی تھی کہ مسلمان جدید علوم و فنون اپنائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اپنی حکومت کی دونوں سرحدوں پر دو مدرسے قائم کیے:

۱۔ کلکتہ میں مدرسہ عالیہ

۲۔ دہلی میں دِلّی کالج

آہستہ آہستہ علماء کی پالیسی میں بھی تبدیلی آئی۔ انہوں نے مشروط طور سے انگریزی پڑھنے اور ملازمت کرنے کی اجازت دے دی۔ اگرچہ عام طور سے اس کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھا گیا کیوں کہ جب شاہ عبدالعزیز نے مشروط طور پر مولوی عبدالحی صاحب کو انگریزی ملازمت کی اجازت دی تو شاہ غلام علی مجددی دہلوی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں احتجاج کیا:

حضرت سلامت سلمکم اللہ تعالیٰ علی	حضرت سلامت۔ اللہ تعالیٰ آپ کو
رؤس الفقراء باختیار الفقراء، بعد تسلیمات	فقیروں کے سر پر فقیروں کے اختیار کے
کثیرہ معروض می دارد کہ دریں وقت شخصے	ساتھ سلامت رکھے۔ تسلیماتِ کثیرہ کے
ظاہر نمود کہ در مدرسۂ ما فقیران مذکور نوکری	بعد عرض ہے کہ اس وقت ایک شخص نے
کفار فرنگ و قبول خدمت افتامی شود	بتایا ہے کہ ہم فقیروں کے مدرسہ میں کفار

(حاشیہ صفحہ سابقہ)، [۲] ہمارا خیال ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے دارالحرب کا فتویٰ ۱۸۰۶ء اور ۱۸۰۹ء کے درمیان دیا ہے۔ انہوں نے مولوی عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۸۰۹ء) کو ایک خط لکھا ہے جس میں دارالحرب کا ذکر ہے۔ (تذکرۂ کاملانِ رام پور، ص ۲۰۳)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] فتاویٰ عزیزی ص ۱۱۷ (بسلسلہ طعام با فرنگیاں)، ص ۱۱۹ (بسلسلہ نوکری)، فتاویٰ مولانا شاہ رفیع الدین (مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۰۴ء) ص ۱۰-۱۱

خدا آگاہ است کہ فقیر را شرف علم و
علم را شرف بنی آدم گردانید۔ ازیں
خبر ایں فقیر بسیار تاسف نمود، خاک
نشینی فقرا بہ از صدر نشینی اغنیا ہرگز
مولوی عبدالحی صاحب قصد ایں امر
نامبارک نکنند و بر نان پارہ قناعت
ساختہ للہ فی اللہ درس طالبان علم
فرمایند و اوقات بذکر و مراقبہ محمود دارند
و دریں جا ہرگز ہرگز بعلاقہ نشوند۔ ترک
و تجرید در سازیم و ہر نفس را نفس آخریں
انگاریم، برائے خدا باشیم بطور بزرگان
خود و سلف صالح خود زیادہ امیدوار
عفو گستاخی است و بشنیدن خبر نیک
آنجا دل خوش می شود و بانچہ لائق شاہ
درویشی نیست مشوش معذور خواہند
داشت زیادہ چہ ۔[1]

فرنگ کی نوکری اور مفتی کا عہدہ قبول کرنے کا
ذکر ہوتا ہے خدا جانتا ہے کہ جس نے فقر کو
علم کا شرف اور علم کو بنی آدم کے لیے شرف
بنایا۔ اس خبر سے اس فقیر کو بہت افسوس ہوا
فقرا کی خاک نشینی اغنیا کی صدر نشینی سے بہتر ہے
عبدالحی صاحب اس نامبارک کام (مفتی کا
منصب قبول کرنے) کا ہرگز ارادہ نہ کریں نان
پارہ پر قناعت کریں۔ للہ فی اللہ طالبان علم
کو درس دیں۔ ذکر و مراقبہ میں مشغول رہیں اور
اس جگہ ہرگز ہرگز تعلق (ملازمت) نہ کریں۔ ہم
لوگ ترک و تجرید اختیار کریں اور ہر سانس کو آخری
سانس سمجھیں۔ خدا کے لیے اپنے بزرگوں اور
سلف صالحین کے طریقہ پر رہیں میں گستاخی
کی معافی کا امیدوار ہوں وہاں (مدرسہ عزیزی)
کی اچھی خبر سننے سے دل خوش ہوتا ہے اور جو
بات درویشی کی شان کے لائق نہیں ہے اس
کے سننے سے تشویش ہوتی ہے۔ معذور رکھیں
زیادہ کیا لکھوں ۔

شاہ غلام علی مجددی کے اس خط سے اس دور کی فضا اور ماحول کا اندازہ لگایا جا سکتا

---

[1] فتاویٰ عزیزی جلد اول (فارسی) ص ۸۶

ہے۔ چنانچہ جو لوگ انگریزی سرکار کی ملازمت اختیار کر چکے تھے۔ خانقاہِ مجددیہ کے مشائخ بالخصوص ان کی نذر قبول نہیں کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے اس طریقۂ کار کی وضاحت کی ہے [1]

جب ۱۸۰۶ء میں دہلی میں انگریزی نظم ونسق قائم ہوا اور انگریزوں نے عدالتوں کی تنظیم کی تو اس وقت دہلی میں نامور علما وفضلا موجود تھے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ محمد اسحاق، شاہ اسمٰعیل، مولانا عبدالخالق، شاہ غلام علی، نواب قطب الدین خان، مولوی محبوب علی، مولوی کرامت علی وغیرہ کے نام خاص طور سے ذہن میں آرہے ہیں [2]۔ ان میں سے کسی نے مفتی یا صدر الصدور کی حیثیت سے انگریزی ملازمت اختیار نہیں کی بلکہ خیرآباد کے رہنے والے مولانا فضل امام پہلے مفتی اور پھر صدر الصدور کے منصب پر دہلی میں فائز ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اودھ کے دو خاندانوں نے مجموعی طور سے دولت انگلشیہ کے آغاز میں انگریزی ملازمت اختیار کی اور سرکاری نظم ونسق کے قیام واستحکام میں مدد دی۔

پہلا خاندان قاضی القضاۃ قاضی نجم الدولہ نجم الدین کاکوروی کا ہے کہ وہ کلکتہ میں سب سے پہلے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ ان کے ارکانِ خاندان کی فہرست ملاحظہ ہو جو سرکاری ملازمت میں منسلک رہے:

۱۔ قاضی القضاۃ قاضی نجم الدولہ نجم الدین بن ملا حمید الدین (ف ۱۲۲۹ھ) ص ۴۳۲ [3]

---

[1] فتاوٰی عزیزی، جلد اول (فارسی) ص ۱۱۹۔

[2] علماء کے یہ نام آثار الصنادید از سرسید احمد خان (سنٹرل بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۵ء) باب چہارم سے ماخوذ ہیں۔

[3] یہ صفحات تذکرہ مشاہیر کاکوری از محمد علی حیدر (اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء) کے ہیں نیز دیکھیے سخنورانِ کاکوری (کراچی ۱۹۷۸ء)۔

۲۔ قاضی امام الدین بن ملا حمید الدین، قاضی صوبہ بہار (ف ۱۲۲۹ھ) ص ۴۰
۳۔ قاضی علیم الدین صدر اعلیٰ بن قاضی نجم الدین (ف ۱۲۵۷ھ) ص ۲۵۷
۴۔ قاضی حکیم الدین صدر الصدور بن قاضی نجم الدین (ف ۱۲۹۶ھ) ص ۱۳۲
۵۔ ممتاز العلماء قاضی سعید الدین قاضی دائر و سائر بن قاضی نجم الدین (ف ۱۳۰۰ھ) ص ۱۶۹
۶۔ مفتی خلیل الدین خان بہادر سفیر شاہ اودھ بدربار گورنر جنرل بن قاضی نجم الدین (ف ۱۲۸۱ھ) ص ۱۴۶
۷۔ مولوی مسیح الدین خان بہادر میر منشی گورنر جنرل بہادر و سفیر شاہ اودھ بن مولوی علیم الدین بن قاضی نجم الدین (ف ۱۲۹۹ھ) ص ۴۰۰
۸۔ مولوی ریاض الدین مفتی و منصف بن مولوی علیم الدین بن قاضی نجم الدین (ف ۱۲۹۵ھ) ص ۱۷۸
۹۔ رضی الدین خاں صدر الصدور بن مولوی علیم الدین بن قاضی نجم الدین (ف ۱۲۷۴ھ) ص ۱۷۵
۱۰۔ مفتی شہاب الدین صدر الصدور بن حاجی امین الدین بن ملا حمید الدین (ف ۱۲۵۶ھ) ص ۲۰۹۔
۱۱۔ وحید الدین قاضی بن قاضی امام الدین بن ملا حمید الدین (ف ۱۲۷۳ھ) ص ۲۷۴
۱۲۔ مولوی مجید الدین خان بہادر صدر اعلیٰ بن مولوی حفیظ الدین خاں بن قاضی امام الدین بن ملا حمید الدین (ف ۱۲۷۰ھ) ص ۱۳۸۔

دوسرا خاندان مولانا فضل امام خیر آبادی کا ہے۔ انہوں نے اور ان کے صاحبزادگان اور دوسرے اعزہ نے سرکاری خدمات باحسن وجوہ انجام دیں جیسا کہ ذیل کی فہرست سے ظاہر ہے:

۱۔ مولانا فضل امام بن شیخ محمد ارشد فاروقی خیر آبادی (ف ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء) دہلی میں مفتی عدالت اور بعد ازاں صدر الصدور ہوئے۔ رشوت کے الزام میں

ملازمت سے برطرف ہوئے[1] کچھ دنوں ریاست پٹیالہ سے وابستہ رہے۔

۲۔ مولوی محمد صالح بن شیخ محمد ارشد خیرآبادی[2]

مولانا فضل امام کے چھوٹے بھائی، سرکاری اخبار نویس۔ اکثر راجپوتانہ میں فرائض منصبی ادا کیے۔

۳۔ مولانا فضل الرحمٰن بن مولانا فضل امام خیرآبادی۔

ریاست پٹیالہ میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ ان کے دو بیٹے مولوی فضل حکیم اور فضل علیم تھے۔ فضل حکیم کے بیٹے خان بہادر فضل متین سیشن جج پٹیالہ تھے۔

۴۔ مولوی منشی فضل عظیم بن مولانا فضل امام خیرآبادی۔

ولیم فریزر کے خاص معتمد و منشی رہے اس لیے منشی فضل عظیم مشہور ہوئے۔ جنگ گورکھال میں خدمات انجام دیں۔ تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)۔

۵۔ مولانا فضل حق بن مولانا فضل امام خیرآبادی۔

سررشتہ دار عدالت دیوانی (رزیڈنسی دہلی)

۶۔ منشی کرم احمد بن فضل احمد بن احمد حسین (برادر مولانا فضل امام خیرآبادی)

جنرل آکٹرلونی کے منشی اور سرکاری اخبار نویس رہے بعد ازاں امجد علی شاہ (اودھ) کے وزیر نواب شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں کے میر منشی رہے۔

۷۔ برکت علی خان۔ مولانا فضل امام خیرآبادی کے حقیقی بھانجے۔

جنرل آکٹرلونی کے میر منشی، مختلف خدمات پر مامور رہے۔

---

[1] علم و عمل جلد دوم (وقائع عبدالقادر خانی) ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سنہ ۱۹۶۱ء) ص ۱۹۹

[2] فضلائے خیرآباد کی یہ فہرست باغی ہندوستان مرتبہ عبدالشاہد خان شروانی (مکتبہ قادریہ لاہور سنہ ۱۹۷۴ء) علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) اور تاریخ ٹونک از اصغر علی آبرو (آگرہ ۱۲۹۶ھ) سے ماخوذ ہے۔

۸۔ الٰہی بخش نازش ولد محمد صالح (ف ۱۲۸۹ھ) وکیل ریاست ٹونک (در اجمیر ایجنسی و میواڑ)[1]

۹۔ تفضل حسین بن محفوظ علی خاں۔ مولانا فضل امام خیرآبادی کی بھانجی کے فرزند (ف ۱۲۷۰ھ)

جنرل آکٹرلونی کے یہاں بحیثیت وکیل ریاست ٹونک رہے۔[2]

۱۰۔ احمد بخش خیرآبادی۔ اخبار نویس کشن گڑھ منجانب سرکار۔ (رشتہ دار)

۱۱۔ مولوی قادر بخش خیرآبادی۔ عدالت فوجداری پٹیالہ میں صدر الصدور رہے (رشتہ دار)

۱۲۔ مولوی غلام قادر گوپاموی (سبط مولانا فضل امام) ناظر سر رشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیلدار گوڑگانوں۔

مولانا فضل امام کے ارکان خاندان اور اعزہ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے جن کی بدولت ان کو عزت و ناموری اور مرفہ الحالی اور فارغ البالی حاصل ہوئی۔ انگریزی حکومت کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے مقدمہ میں اسپیشل کمشنر نے اپنے فیصلہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے[3]

> "وہ (مولانا فضل حق) اودھ کا باشندہ ہے اور ایک ایسے خاندان کا فرد ہے جو انگریزی حکومت کا ساختہ پرداختہ ہے بلکہ ایک زمانہ میں وہ خود بھی سرکاری ملازمت میں اچھے بڑے عہدہ پر متمکن تھا لیکن گزشتہ کئی برس سے ملازمت ترک کر کے 'اودھ' 'رام پور' الور وغیرہ متعدد دیسی ریاستوں میں معقول عہدوں پر ممتاز رہا ہے۔ اس کی ہمیشہ بہت شہرت رہی ہے۔"

---

[1] تاریخ ٹونک صفحہ ۴۵ [2] ایضاً صفحہ ۴۲

[3] ماہنامہ "تحریک" دہلی ۱۹۶۰ء ص ۱۶-۱۷۔

مولانا فضل حق خیر آبادی نے اس کی تائید کی ہے چنانچہ وہ اپنی درخواست بنام وزیر ہند (جنوری سنہ ۱۸۶۱ء) میں لکھتے ہیں[1]

"جیسا کہ اسپیشل کمشنر نے بھی اپنے فیصلہ میں ذکر کیا ہے کہ میرا خاندان اپنی دنیوی حیثیت کے لیے بہت حد تک سرکارِ انگریزی کا رہین منت ہے۔ ایک زمانہ میں خود میں بھی انگریزی ملازمت میں بہت اچھے عہدے پر متمکن تھا۔"

اب ہم ان مقامات کے تحت جہاں جہاں مولانا فضل حق خیر آبادی ملازم رہے ہیں ان کے دورِ ملازمت کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

دہلی

مولانا فضل امام دہلی میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ ان کے بڑے بیٹے منشی فضل عظیم ولیم فریزر کے معتمد و منشی تھے۔ خیال یہ ہے کہ ۱۶-۱۸۱۵ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی بھی سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوئے ہوں گے۔

انہوں نے مولانا حیدر علی فیض آبادی صاحب منتہی الکلام[2] (ف ۱۲۹۹ھ) کو ۵ ذیقعدہ ۱۲۳۱ھ کو ایک خط لکھا ہے[3]۔ جس میں انہوں نے حاکم کی طرف سے "مفوضہ فرائض" میں انہماک کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت ملازمت میں آچکے تھے اور بادشاہ

---

[1] ماہنامہ "تحریک" دہلی سنہ ۱۹۶۰ء ص ۲۲

[2] ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (مولوی رحمان علی) مترجمہ و مرتبہ محمد ایوب قادری (کراچی سنہ ۱۹۶۱ء) ص ۱۷۵

[3] اس مقالہ میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے جتنے خطوط یا منظومات کا حوالہ ہے وہ سب ان کی بیاض سے ماخوذ ہیں جس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی محب مکرم حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کے ذخیرہ علمیہ میں ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ان کا آنا جانا تھا۔ مولانا فیض آبادی نے ایک خط شوال ۱۲۳۱ھ میں بھی مولانا فضل حق خیر آبادی کو لکھا تھا جس کا اسی خط میں مولانا خیر آبادی نے ذکر کیا ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کا تقرر سب سے پہلے کس منصب پر ہوا۔ اس سلسلے میں کوئی تحریری شہادت نہیں ملتی لیکن ملازمت سے مستعفی ہونے کے وقت وہ سر رشتہ دار عدالت دیوانی تھے جیسا کہ مرزا غالب نے لکھا ہے[۱] اور یہ عدالت رزیڈنسی دہلی کے تحت تھی اس لیے بعض لوگوں نے مولانا فضل حق کو سر رشتہ دار رزیڈنٹ اور کسی نے سر رشتہ دار کمشنر دہلی یا سر رشتہ دار عدالت ضلع بھی لکھا ہے[۲]۔

مولانا فضل حق کے مقدمہ میں صفائی کے پہلے گواہ مولوی قادر بخش خیر آبادی نے کہا[۳]۔

"یہ (مولانا فضل حق) طامس مٹکاف کمشنر کے پاس بھی بطور سر رشتہ دار ملازم رہے ہیں"

اور صفائی کے دوسرے گواہ نبی بخش خیر آبادی کا بیان ہے[۴]۔

میں مولوی فضل حق کو بچپن سے جانتا ہوں۔ ان کے والد مولوی فضل امام تھے وہ بھی دہلی میں انگریزی راج میں مفتی تھے۔ مولوی فضل حق بہت برس

(حاشیہ از صفحہ سابقہ) اصل بیاض حکیم نصیر الدین (نظامی دواخانہ، کراچی) کی ملکیت ہے۔ وہ بھی ہماری نظر سے گزری ہے۔ محولہ بالا خط کے لیے ملاحظہ ہو ص ۱۳۲-۱۳۴۔ کتابت کی غلطی سے باغی ہندوستان (طبع ۱۹۷۴ء، لاہور) میں ۱۲۳۱ھ کی بجائے ۱۲۶۱ھ چھپ گیا ہے۔

۱؎ کلیات نثر غالب (مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۱ء) ص ۱۴۰

۲؎ آب حیات از محمد حسین آزاد (لاہور ۱۹۵۶ء) ص ۵۰۵۔

۳؎ ماہنامہ "تحریک" دہلی جون ۱۹۶۰ء ص ۱۳

۴؎ ایضاً ص ۱۴

اپنے والد کے ساتھ دہلی میں رہے اور میں نے سنا ہے کہ یہ وہاں سر رشتہ دار تھے۔"

۱۸۱۷ء میں دہلی رزیڈنسی میں جو انگریز حکام تھے ان کے متعلق ہم عصر وقائع نگار مولوی عبدالقادر رام پوری لکھتے ہیں[1]:

"اس شہر میں سیشن صاحب عدالت فوجداری اور دیوانی ..... میں بہت نیک نام رہے اور رزیڈنسی میں چارلس مٹکاف صاحب رزیڈنسی کے متعلق امرار میں بہت نامور رہے۔ فارتسکو اور ولیم صاحب بے رورعایت و انصاف میں مشہور رہے ہیں۔ شان و شوکت میں جنرل اکٹرلونی صاحب شہرۂ آفاق، رعایا کی آسائش میں گارڈنر صاحب، زود فہمی اور واقفیت میں ولیم فریزر صاحب، تحقیقات اور رشوت ستانی کی روک تھام میں ہنرل کو مدلس صاحب، سلامت روی اور غارت گری کے انتظام میں ویلڈر صاحب اور نیک مزاجی میں طامس مٹکاف صاحب مشہور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ طامس مٹکاف صاحب خوش طبع، سیر چشم، رفیق پرور اور پاک دل ہے۔"

مندرجہ بالا افسران اور حکام میں سے اکثر کے ساتھ مولانا فضل حق خیر آبادی کا رابطہ اور تعلق رہا ہے۔ دہلی کی رزیڈنسی کا تعلق جودھ پور، جے پور، کوٹہ، بوندی، سروہی، اودے پور، جیسلمیر، الور، بھرت پور، پٹیالہ، جیند، کیتھل، لاہور اور کشن گڑھ سے تھا۔

مولانا فضل حق بحیثیت سر رشتہ دار اپنے افسر اعلیٰ کے ہمراہ اکثر دورہ میں رہتے تھے جیسا کہ ان کے بعض مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ مکتوب بنام والد ماجد مولانا فضل امام خیر آبادی بسلسلہ تعزیت پھوپھی زاد بھائی

---

[1] علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول، ص ۳۲۲۔

محمد بقا ۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء (از دوجانہ)

۲۔ مکتوب دیگر بنام مولانا فضل امام خیر آبادی ۱۲۳۵ھ (از سفر)

۳۔ تحریر بنام مولانا فضل امام (از پانی پت)

۴۔ مکتوب بنام مفتی خلیل الدین کاکوروی (۱۲۳۶ھ، از سفر)

۵۔ مکتوب بنام شیخ احمد شروانی (۱۲۳۶ھ، از سفر)

۶۔ مکتوب بنام شیخ احمد حمید (۱۲۳۶ھ، از سفر)

۷۔ قصیدہ نعتیہ (۱۲۳۶ھ) (ہانسی)

۸۔ قصیدہ نعتیہ (۱۲۳۷ھ) بوقت رحلت از دہلی بجانب ضلع شمالی

۹۔ قصیدہ بنام مولوی رشید الدین خاں دہلی (۱۲۳۷ھ) (کنار نہر جمنا)

۱۰۔ قصیدہ بنام شیخ احمد شروانی (۱۲۳۶ھ) (از نواح دہلی)

۱۱۔ مرثیہ فیض اللہ خاں (۱۲۳۶ھ) (از پانی پت)

مولانا فضل حق نے یہ منظومات و مکتوبات[1] اپنے دورہ کے زمانہ میں اپنے متعلقین اور احباب کو لکھے ہیں۔ ہم عصر وقائع نگار مولوی عبدالقادر رام پوری لکھتے ہیں[2]

"۲۶ شوال ۱۲۳۸ھ مطابق ۶ جولائی ۱۸۲۳ء کو مولوی فضل حق اور رشید الدین نے بندہ (مولوی عبدالقادر) کو دیکھنے کے لیے قدم رنجہ فرمایا۔ اگلے دن بازدید کے لیے رشید الدین خاں کے دولت کدہ پر گیا۔"

خیال یہ ہے کہ ۱۲۴۵ھ / ۱۸۳۱ء میں مولانا فضل حق نے عدالت دیوانی دہلی کی سر رشتہ داری سے استعفا دے دیا اور انہوں نے نواب جھجر کے بلانے پر جھجر کی راہ لی

---

[1] حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو بیاض مولانا فضل حق خیر آبادی۔

[2] علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد دوم ص ۱۸۵

اس سلسلے میں مرزا غالب کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو[1]

آرزو را سر انجام گفت گو داده
می شود، نهفته مباد که قدر نا شناسی
حکام رنگ آں ریخت که فاضل
بے نظیر و یگانه مولوی فضل حق از سر رشته
داری عدالت دہلی استعفا کرده خود
را از ننگ و عار وار ہاند خفا که اگر
پایه علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل
حق آں مایه بکاہند که از صد یک واماند
دریا ز آں پایه را بسر رشته داری عدالت
دیوانی سنجند، ہنوز ایں عہده دون مرتبه
وے خواہد بود، بالجملہ بعد ازیں استعفا
نواب فیض محمد خاں پانصد روپیه
ماہانه برائے مصارف خدام مخدومی
معین کرده و نزد خود خواند روزے
که مولوی فضل حق ازیں دیار می رفت
ولی عہد خسرو دہلی صاحب عالم مرزا
ابوظفر بہادر مولانا را تا پدرود کنند
سوئے خود طلبید و دو شاله ملبوس

اب مدعائے نگارش سنیے حکام کی
بدتمیزی اور قدر ناشناسی کی بدولت
فاضل بے نظیر مولوی فضل حق نے
سر رشتہ داری عدالت دہلی کی خدمت
سے استعفے دے دیا اور اس خدمت
کے ننگ و عار سے چھوٹ گئے۔
سچ تو یہ ہے کہ اس سے ہزار درجہ
بلند منصب بھی ان کے علم و فضل
کے شایانِ شان نہ تھا۔ اس استعفا
کے بعد نواب فیض محمد خاں نے
ان کے خادموں کے مصارف کے
لیے پانچ سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر
کے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ کیا بتاؤں
کہ جب مولوی فضل حق اس شہر سے
رخصت ہوئے تو اہل شہر کے
دلوں پر کیا گزر گئی۔ شاہ دہلی کے
ولی عہد مرزا ابوظفر بہادر نے روانگی
سے پہلے مولانا کو طلب کر کے دو شالہ

---

[1] کلیاتِ نثر غالب ص ۱۴۸، پنج آہنگ (مرزا غالب) مترجمہ محمد عمر مہاجر (کراچی ۱۹۶۹ء) ص ۵۸ - ۶۰

خاص بردوش وے نہاد و آب در دیدہ
گردانید و فرمود کہ ہرگاہ شما می گوئید کہ
من رخصت می شوم مرا جزایں کہ
بپذیرم گزیر نیست، اما ایزد دانا داند
کہ لفظ وداع از دل بزبان نمی رسد
الا بصد جر ثقیل، تا ایں جا سخن ولیعہد
بہادر است، غالب مستہام از شما می
خواہد کہ واقعہ تودیعہ مولوی فضل حق و
اندوہناکی ولی عہد بہادر و بدرد آمدن
دلہائے اہلِ شہر بعبارتے روشن
و بیانِ دل آویز در آئینہ سکندر
بقالب طبع در آید و مراد دریں تفقد منت
پذیرا نگارید۔

دیا اور خلعت خاص مرحمت فرمائی اور
آبدیدہ ہو کر کہا کہ آپ رخصت ہو
رہے ہیں مگر وداع کا لفظ زبان پہ
نہیں آتا۔ اسے دل سے لبوں تک
کھینچ لانے کے لیے ہزار جر ثقیل
درکار ہیں۔ یہاں تک ولی عہد بہادر
کا ارشاد ہے۔ اب آپ سے میری
استدعا ہے کہ مولوی فضل حق کے وداع
پر ولی عہد کی اندوہناکی اور اہل شہر
کے اضطراب کا حال مناسب اور
دل آویز پیرایہ میں لکھ کر آئینہ
سکندری میں چھاپ دیجیے یہ مجھ پر
منت ہوگی۔

مرزا غالب کے اس خط سے معلوم ہوا کہ مولانا خیرآبادی حکام کی قدر ناشناسی کی بنا پر اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے۔ ۵ر ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ کو ان کے والد مولانا فضل امام کا انتقال ہوا۔ انہوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد یعنی ۱۲۴۵ھ میں استعفیٰ دیا ہوگا۔ گویا وہ کم و بیش چودہ پندرہ سال سرکاری ملازمت میں رہے۔

مولانا فضل حق مجلس علما کے صدر نشیں تھے علم و فضل میں اپنی مثال آپ تھے۔ علوم معقول اور عربی شعر و ادب میں ان کا کوئی نظیر نہ تھا۔ اصحاب علم و فضل اور ارباب شعر و ادب دور دور سے اپنی تصنیفات و منظومات ان کی خدمت میں ارسال کرتے تھے۔ نامور علما اپنی تصنیفات پر ان سے تقاریظ لکھاتے تھے۔ اس دور میں جو فتوے جاری ہوئے

ہیں اُن پر مولانا فضل حق کے دستخط ثبت ہیں۔ علمائے وقت مفتی صدرالدین آزردہ (ف ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) مولانا رشید الدین خاں دہلوی (ف ۱۲۴۹ھ / ۱۸۲۷ء) مولانا فضل رسول بدایونی (ف ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) مولانا محمد حسن خاں صدر الصدور بریلوی (ف ۱۸۷۳ء) وغیرہ سے ان کے خصوصی تعلقات تھے[1] ضرورت ہے کہ اس اعتبار سے مولانا فضل حق کی کتاب حیات کی ورق گردانی کی جائے۔

شعر و ادب کی مجلس میں وہ یگانہ ہیں۔ مرزا غالب جیسا شاعر شعر کی پرکھ اور انتخاب میں ان کا رہینِ منت ہے۔ بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود "مولانا فضل حق اور مرزا غالب"، کا عنوان تشنۂ تحقیق ہے۔ اسی طرح مومن، منیر شکوہ آبادی اور دوسرے شعرائے دہلی سے مولانا فضل حق کے تعلقات کا سراغ لگایا جائے۔ مومن، مولانا فضل حق کے باب میں کہنے پر مجبور ہوئے ہیں:

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے لاچار جی سے ہم

مولانا فضل حق اور امراء و عمائدینِ دہلی کے روابط کی تحقیق و تفتیش بھی کی جائے، حکیم احسن اللہ خاں، مصطفےٰ خاں شیفتہ، نواب حسام الدین حیدر نامی کتنے ایسے اربابِ دول ہیں کہ جن سے مولانا فضل حق کے تعلقات رہے ہیں۔

یہاں ہم وہابی تحریک کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جس کے قائد اس دور میں شاہ اسماعیل شہید (ف ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) تھے۔ وہ امام ابن تیمیہ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب

---

[1] ان علماء کے تعلقات کا اندازہ ہمیں مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا محمد حسن خاں بریلوی اور مولانا خیر آبادی کے اس مجموعہ تحریرات سے ہوا جو رضا لائبریری رام پور میں "شبہ لزوم لزومات اعتباریہ فی العقول المجردہ" (خطی ۵۲، ۱۱) کے نام سے محفوظ ہے

نجدی سے متاثر تھے اور انھوں نے کتاب التوحید کے انداز پر رسالہ تقویۃ الایمان لکھا اس کا لہجہ سخت اور بعض جگہ غیر محتاط عبارتیں ہیں۔ جن سے شفاعت کا انکار اور امکانِ نظیر کی تائید ہوتی ہے۔ شاہ اسماعیل نے عدم تقلید، رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے مسائل بھی چھیڑے۔ مولانا فضل حق نے ان افکار و خیالات کی تردید کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ۱۲۴۰ھ میں تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ اور امتناع النظیر جیسی کتابیں لکھیں۔

عدم تقلید، رفع یدین اور آمین بالجہر مسائل کا نوٹس سب سے پہلے مولانا محبوب علی دہلوی تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز نے لیا اور انھوں نے

۱۔ اختصار الصیانۃ
۲۔ صیانۃ الایمان
۳۔ رسالہ دربیان عدم جواز رفع سبابہ۔
۴۔ تصویر التنویر فی سنۃ البشیر والنذیر (رد تنویر العینین)
۵۔ تحریر مجبوب بطرز مکتوب۔

کتابیں لکھ کر اس جدید فکر کے خلاف بند باندھا۔

آخر میں ہم مولانا فضل حق خیر آبادی کے ان تلامذہ کی فہرست دے رہے ہیں جنھوں نے ہمارے اندازے کے مطابق دہلی میں مولانا سے تحصیل علم کی۔[1]

۱۔ حکیم امام الدین دہلوی طبیب اکبر شاہ ثانی و بہادر شاہ ظفر و وزیر الدولہ نواب ٹونک (ص ۸۵)
۲۔ مولانا شیخ محمد تھانوی ولد شیخ حمد اللہ (ف ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) (ص ۴۱۲)
۳۔ مولانا نور الحسن ولد مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (ف ۱۲۸۵ھ) (ص ۵۱۱)
۴۔ حکیم نور الحسن بن حکیم نثار علی امروہوی (ص ۵۱۲)

---

[1] یہ صفحات نزہۃ الخواطر جلد ہفتم از حکیم عبدالحی سے لیے گئے ہیں۔

رام پوری کے بیان کے مطابق جھجر کے نواب کی حیثیت اکبر شاہ ثانی سے زیادہ تھی[1] نواب نجابت علی خاں کا انتقال ۱۸۱۴ء میں ہوا۔ اس وقت نواب محمد خاں کم عمر تھے، اور حکومت کے مختار کار فیض طلب خاں ہوئے۔

جب نواب فیض محمد خاں نے ریاست کا کاروبار ہاتھ میں لیا تو کاروبار ریاست میں خوب ترقی آگئی، دربار و سرکار کی شان دوبالا ہوگئی اور انتظام فوج اور انتظام ملکی و ریاست کا بخوبی ہوا۔[2]

نواب فیض محمد خاں کے زمانے میں کئی نامور علماء، حکماء و شعراء ان کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ حکیم غلام حسن خاں بن بو علی خاں، حکیم محمدی بیگ پانی پتی، مولوی عمادالدین، حکیم احسن اللہ خاں، حکیم محمد حسن خاں سنبھلی اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے نام تذکروں میں ملتے ہیں۔[3] منشی غلام نبی مولف تاریخ جھجر حکیم محمد حسنؒ کے متعلق لکھتے ہیں:[4]

"یہ شخص قدیم رہنے والا سنبھل ضلع مرادآباد کا تھا مگر نشو و نما اور فروغ اس کا دہلی میں ہوا اور بذریعہ حسن علی خاں برادر کوچک نواب فیض محمد خاں کے اس کی ریاست میں بعہدہ طبابت نوکر رہا۔ تا زمانہ حکومت نواب فیض محمد خاں کے جھجر میں رہا اور پھر بعہد فیض علی خاں بادشاہ دہلی کے یہاں نوکر ہو گیا۔"

نواب فیض محمد خاں کی طلبی پر مولانا فضل حق خیر آبادی ریاست جھجر میں تشریف لائے اس وقت ولی عہد بہادر شاہ ظفر کو خاصا رنج و قلق ہوا جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ ریاست

۱۔ ایضاً۔ علم و عقل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول، ص ۱۸۹-۱۹۲

۲۔ تاریخ ضلع روہتک از رائے پنڈت مہاراج کشن (وکٹوریہ پریس لاہور ۱۸۸۴ء) ص ۵

۳۔ تاریخ جھجر از منشی غلام نبی تحصیلدار (مطبع فیض احمدی ۱۸۶۶ء) ص ۲۱۱۔

۴۔ ایضاً، ص ۲۱۰

۵۔ نواب ضیاء الدین خاں نیّر درخشاں [۱]

۶۔ قلندر علی زبیری پانی پتی مولف تنزیل التنذیر فی نظیر البشیر والنذیر (ف ۱۳۲۳ھ)[۲]

۷۔ منشی داد اربخش پنجابی [۳]

۸۔ مولوی غلام قادر گوپاموی (سبط مولانا فضل امام) ناظر سر رشتہ دار عدالت دیوانی تحصیلدار گوڑگانوں [۴]

۹۔ ملا فتح الدین لاہوری [۵]

جھجر

مولانا فضل حق خیرآبادی دہلی کی ملازمت ترک کر کے نواب فیض محمد خاں کے یہاں پہنچے جو دہلی ریزیڈنسی کے ایک جاگیردار تھے اور اچھی حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے والد نجابت علی خاں نے فتح دہلی (۱۸۰۳ء) کے موقع پر لارڈ لیک کی مدد کی تھی جس کے صلے میں انگریزی سرکار کی طرف سے ان کو جاگیر ملی۔ لارڈ لیک خود ان کے گھر گیا اور عزت افزائی کی [۶] اس وجہ سے انگریزی سرکار میں نواب جھجر کی خاص عزت و اہمیت تھی۔ نواب کی اپنی فوج تھی۔ دربار کی شان و شوکت تھی بلکہ ہم عصر وقائع نگار مولوی عبد القادر

---

[۱] تلامذہ غالب از مالک رام (مرکز تصنیف و تالیف نکودر، ۱۹۵۷ء) ص ۲۸۷۔

[۲] باغی ہندوستان، ص ۱۲

[۳] تذکرہ علمائے حال، ص ۱۲

[۴] باغی ہندوستان، ص ۱۶۵

[۵] اکمل التاریخ۔ جلد اول از مولوی محمد یعقوب ضیاء قادری، ص ۸۹۔

[۶] علم و عمل (وقائع عبد القادر خانی) جلد اول، ص ۱۸۹-۱۹۲

جھجر میں مولانا فضل حق کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر نہیں ملتا ہم عصر مؤرخ منشی غلام نبی خاں مؤلف تاریخ جھجر لکھتے ہیں :[۱]

"مولوی فضل حق، یہ شخص رہنے والا خیر آباد کا تھا اور آدمی بڑا نامی گرامی اور علم و فضل میں ایک علامہ روزگار تھا کہ ہندوستان میں مثل اس کے دوسرا ہم عصر کم ہو گا۔ جب اس نے عہدہ سرشتہ داری دہلی کو چھوڑا تو قدر دانی فیض محمد خاں سے وہ جھجر میں آیا اور ایک مدت مصاحبت نواب میں رہا۔ آخر کار بسبب وارستہ مزاجی اپنی کے نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔"

خیال یہ ہے کہ نواب فیض محمد خاں کے انتقال (۱۶ اکتوبر ۱۸۳۵ء) کے بعد جھجر کی یہ محفلِ اکابر و افاضل درہم برہم ہو گئی ہو گی۔ حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم محمد حسن خاں دہلی چلے گئے۔ اسی زمانے میں مولانا فضل حق نے بھی جھجر کو خیر باد کہا ہو گا۔ جھجر کے قیام میں مولانا خیر آبادی کو مصاحبتِ دربار سے واسطہ رہا لیکن خیال یہ ہے کہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی رہا ہو گا اور طلباء نے اکتسابِ فیض کیا ہو گا۔

نواب فیض محمد خاں کے مشاغل کلیتاً رئیسانہ تھے۔ مؤلف تاریخ جھجر لکھتے ہیں :[۲]

"نواب فیض محمد خاں کے مشاغل کبوتر بازی، مرغ بازی، لعل اور بٹیر بازی پتنگ بازی، پٹے بازی اور تیر اندازی کے تھے۔"

نواب فیض خاں شکار کا بڑا اہتمام کرتے تھے :[۳]

"شکار کے واسطے چالیس جوڑی تازی کتے پلے تھے، مرغانِ صید گر مثلاً باز، جرہ،

---

[۱] تاریخ جھجر از منشی غلام نبی تحصیلدار (مطبع فیض احمدی ؟ ۱۸۶۶ء) ص ۲۱۲۔
[۲] تاریخ جھجر، ص ۱۹۹
[۳] ایضاً،

شکرہ، بحری وغیرہ پلے تھے۔ اسی طرح چیتے پلے تھے۔"
مولوی عبدالقادر رام پوری لکھتے ہیں: [1]

"فیض محمد خاں کا ملک آباد اور فوج وسامان درست ہے۔ اس کو شکار کا بے حد شوق ہے۔ اس کے بچپن کا ایک ہندو ساتھی ریاست کا مختار کل ہے۔ فیض محمد خاں کبھی شاہجہاں آباد میں اور کبھی اپنے علاقہ میں رہتا ہے۔"

فیض محمد خاں کا جانشین اس کا بیٹا فیض علی خاں ہوا جو ۱۲ر دسمبر ۱۸۴۵ء کو فوت ہو گیا۔ پھر اس کا پوتا عبدالرحمٰن رئیس جھجر ہوا جس نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصّہ لیا۔ انگریزی تسلط قائم ہونے کے بعد نواب عبدالرحمٰن خاں گرفتار کر کے لائے گئے اور ۲۳ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو انھیں پھانسی دے دی گئی اور ریاست ضبط ہو گئی۔

سہارن پور

سہارن پور مغربی یو۔ پی (انڈیا) کے ایک ضلع کا صدر مقام اور دامن کوہ کا خوبصورت شہر ہے۔ اس ضلع کے کئی قصبے دیوبند، گنگوہ، انبیہٹہ، منگلور، رام پور (منہاران) وغیرہ مسلم تہذیب و ثقافت کے مرکز رہے ہیں، دیوبند، دارالعلوم کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔

جب لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا تو پھر اس نے آگرہ کا رُخ کیا اور اسے بھی فتح کر لیا بالآخر سندھیا نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کی پیش کش کی۔ دسمبر ۱۸۰۳ء میں فریقین میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رُو سے سندھیا کے دوآبہ کے مقبوضات پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح سہارن پور اور

---

[1] علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد دوم، ص ۳۲۲

مظفر نگر وغیرہ اضلاع انگریزوں کے قبضے میں آگئے اور ستمبر ۱۸۰۴ء میں اس ضلع سہارن پور کا پہلا کلکٹر جی۔ ڈی گیتھری مقرر ہوا اور یہاں آہستہ آہستہ نظم و ضبط قائم ہوا۔[۱]

انیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں مولانا فضل حق کے برادر اکبر مولوی منشی فضل عظیم خیرآبادی سہارن پور میں افسر مقرر ہوئے۔ وہ ولیم فریزر (ف ۱۲ مارچ ۱۸۳۵ء) کے معتمد خاص تھے اور ان کی ترقی میں ولیم فریزر کا خاصا ہاتھ رہا ہے۔ ہم عصر وقائع نگار مولوی عبدالقادر رام پوری لکھتے ہیں:[۲]

"مولوی فضل امام کے بڑے بیٹے منشی فضل عظیم فارسی نظم و نثر میں مہارت رکھتے ہیں۔ جو واقعہ پیش آئے، اس کی کیفیت قلم برداشتہ لکھ دیتے ہیں۔ ولیم فریزر بہادر کی ان پر بے حد شفقت ہے۔"

۱۸۱۴-۱۵ء میں نیپال کے گورکھوں اور انگریزوں سے جنگ ہوئی۔ اس مہم کا سربراہ ولیم فریزر تھا اور فضل عظیم اس کے خاص معتمد اور منشی تھے۔[۳] انھوں نے گورکھوں اور انگریزوں کی جنگ کی کیفیت کو "وقائع کوہستان" کے نام سے قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۶۹ھ مطبع مصطفائی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس وقت منشی فضل عظیم سہارن پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وقائع کوہستان میں منشی فضل عظیم ولیم فریزر کی حیثیت اور اپنی کارگزاری کے متعلق لکھتے ہیں:[۴]

ف ۱۔ تاریخ سہارن پور از منشی نند کشور (مطبع مصدر الہدایہ باندہ ۱۸۷۷ء) تاریخ دیوبند از محبوب رضوی (علمی مرکز دیوبند ۱۹۷۲ء) ص ۱۵۶۔ تاریخ قصبہ تھانہ بھون از شیخ محمد تھانوی (مرتبہ ثناء الحق البلاغ کراچی ۱۳۹۲ھ) ص ۵۲۔

ف ۲۔ علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول ص ۲۵۷۔

ف ۳۔ منشی فضل عظیم فارسی کے شاعر اور انشاء پرداز تھے۔ اکثر تذکروں مثلاً "گلستان سخن (مرزا قادر بخش صابر ص ۳۶۱) شمع انجمن (صدیق حسن خاں ص ۳۲۸) اور صبح گلشن (ص ۲۲۸) میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل ان کا انتقال ہوا۔ ف ۴۔ وقائع راجستھان از منشی فضل عظیم خیرآبادی (مطبع مصطفائی دہلی ۱۲۶۹ھ) ص ۴۔

جنرل سر داؤد اختر لونی صاحب بہادر
مع کمپوی متعینہ لدھیانہ وکرنال بہ مقابلہ
امر سنگھ تھاپا کہ مختار و مدار المہام این محال و
نائب جناب راجہ نیپال بود بطرف رام گڑھ
و بھاٹو وغیرہ مامور و روانہ شدند و کمپو ڈمبرٹھ
بسرکردگی جنرل کلپی صاحب و کمشنری و مختاری
آقای نامدار ذوی الاقتدار مسٹر ولیم فریزر صاحب
بہادر کہ در بہادری و شجاعت ضرب المثل و در
انتظام مالی و ملکی عدیم البدل بود۔ بدین جہت
تنبیہہ و تادیب و اخراج کپتان بھدر و کاجی
رنجور و تسخیر کوہ گڑھوال و کوہ سرمور متعین و
مامور گردید و مسٹر کارنر صاحب بہادر مع
قشون نصرت مقرون و ساز و سامان موزون و
جمعیت از حد افزون برائے تخلیہ کوہ کماؤں
مامور و ماذون گشتند و ہمچنیں دیگر صاحبان
حمیدہ اوصاف و بہادران عرصہ مصاف
از دیگر جوانب و اطراف برائے قتل و اخراج
آں رہ نوردان بادیہ انحراف مقرر و نامزد
شدند۔ راقم این حروف کہ بہ فضل عظیم معروف
است در آں زمان بہمراہی آقای موصوف
بکار نوشت و خواند خطوط و پروانہ جات و

جنرل سر داؤد اختر لونی صاحب بہادر
لدھیانہ اور کرنال میں متعینہ کمپو کیساتھ امر سنگھ
تھاپا کے مقابلہ کے لیے کہ جو راجہ نیپال کا
نائب اور اس محال کا مختار و مدار المہام تھا
رام گڑھ اور بھاٹو وغیرہ کی طرف مامور اور روانہ
ہوئے اور ڈمبرٹھ کا کمپو جنرل کلپی کی سرکردگی
میں تھا۔ کمشنر و مختار آقائے نامدار صاحب
اقتدار مسٹر ولیم فریزر صاحب بہادر کہ جو
بہادری و شجاعت میں ضرب المثل اور مالی و ملکی
انتظام میں بینظیر تھے اسی وجہ سے وہ کپتان
بھدر اور کاجی رنجور کے اخراج اور تنبیہہ و تادیب
کے لیے کوہ گڑھوال اور کوہ سرمور کی فتح کیلئے
مامور و متعین ہوئے اور مسٹر کارنر صاحب
بہادر فتح مند فوج، موزوں ساز و سامان
اور کثیر جمعیت کے ساتھ کوہ کماؤں کے تخلیہ
کے لیے مامور و مقرر ہوئے اس طرح دوسرے
حمیدہ اوصاف کے مالک اور جنگ آزمودہ
بہادر (انگریز) اطراف و جوانب سے ان
باغیوں (گورکھوں) کے قتل و اخراج کے
لیے مقرر و نامزد ہوئے، راقم الحروف کہ
فضل عظیم کے نام سے مشہور ہے اس زمانہ

انتظام مہمات مصروف و بعنایات خاوندانہ آقای خود مالوف بود۔ دریں مہم ہر جا حاضر بود و از سر گزشت و وقائع آں ماہر است نبذی از حال جنگ و جدل سوانح و معارک قتال و خرابی و ابتری آں گروہ مخذلاں مآل بطرز اختصار و اجمال می نگارد۔

میں آقا (ولیم فریزر) کی ہمراہی میں خطوط اور پروانہ جات کے لکھنے پڑھنے اور مہمات کے انتظام میں مصروف اور اپنے آقا (ولیم فریزر) کی حاکمانہ عنایات سے بہرہ ور تھا (راقم الحروف) اس مہم میں ہر جگہ موجود تھا اور اس زمانہ کی سرگذشت اور سارے واقعات سے واقف، لہٰذا جنگ و جدل کا حال، قتل کے معرکوں کے واقعات اور اس بدقسمت گروہ (گورکھوں) کی خرابی و ابتری کا کچھ حال بطور اختصار لکھتا ہوں۔

اس کتاب کے خاتمے پر منشی فضل عظیم لکھتے ہیں:[1]

کمپنی افواج منصور کہ برائے تنبیہہ و اخراج آں قوم مقہور و تخلیہ قلعہ جات متعین و مامور گردیدہ بود، از کوہ فرود آمدہ متفرق شد و ہر یک پلٹن بچھاونی خود رسید و افسانہ جنگ ختم گردید و آقای نامدار ہم بعد از سیر کوہستاں در ماہ اگست ۱۸۱۵ء مراجعت فرمود بہ فرخی و فیروزی داخل شہر دہلی شدند و ایں احقر العباد ہم ہمراہی

فتح مند فوجوں کا کمپو کہ جو اس بدنصیب قوم (گورکھوں) کی تنبیہہ و اخراج کے لیے اور قلعوں کے خالی کرانے کے لیے متعین و مامور ہوا تھا، پہاڑ سے اتر آیا اور منتشر ہو گیا۔ ہر ایک پلٹن اپنی چھاؤنی کو چلی گئی اور جنگ کا قصہ ختم ہو گیا اور آقائے نامدار (ولیم فریزر) کوہستان کی سیر کے بعد ماہ اگست ۱۸۱۵ء میں واپس آئے۔ فتح مندی اور

---

[1] وقائع کوہستان، ص ۲۷

موصوف بشہر مذکور رسیدہ بملاقات عزیزاں
و لقای محباں مسرور و شاد کام و سپاس
گزار ایزد ذوالجلال والاکرام گردیدہ و
بپاس خاطر اطفال دریاد داشت حال
جنگ و جدال تحریر ایں افسانہ پرداخت
وانچہ بچشم خود دریں مہم دیدہ رقم ساخت۔

خوش بختی کے ساتھ شہر دہلی میں داخل
ہوئے اور یہ احقر العباد (فضل عظیم) بھی
شہر مذکور (دہلی) میں صاحب موصوف
(ولیم فریزر) کے ہمراہ آیا۔ اپنے عزیزوں
اور دوستوں کی ملاقات سے مسرور و
خوش اور اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوا اور
اپنے بچوں کے پاس خاطر سے جنگ و
جدل کی یادداشت میں اس کتاب کے
لکھنے میں مشغول ہوا اور جو کچھ اپنی آنکھ
سے اس مہم میں دیکھا وہ لکھ دیا۔

جنگ گورکھاں کے بعد ہی منشی فضل عظیم سہارن پور میں کسی ذمہ دار سرکاری عہدہ پر مامور ہوئے ہیں کیونکہ ۵ ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) کے ایک خط بنام مولوی حیدر علی فیض آبادی میں مولانا فضل حق خیر آبادی لکھتے ہیں:[1]

"آپ کے خط کا جواب میں حاکم کی طرف سے مفوضہ فرائض میں انہماک اور ان پے در پے آلام و مصائب اور درد قولنج کے دورہ اور اقربا میں تین عزیز ترین ہستیوں کی رحلت کی وجہ سے نہ دے سکا، میں اس سلسلے میں کل اخی المکرم المعظم مدظلہ العالی (منشی فضل عظیم) کے پاس سہارن پور جا رہا ہوں اور یہاں (دہلی) دو ماہ بعد واپس ہونے کی توقع ہے۔"

محمد فضل حق عمری حنفی خیر آبادی ۵ ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ

۱۔ بیاض مولانا فضل حق خیر آبادی، ص ۱۳۲

ہمارا خیال یہ ہے کہ منشی فضل عظیم، ولیم فریزر کے ہمراہ مختلف فرائض مفوضہ انجام دیتے رہے ہیں اور اس کے ساتھ دورے پر بھی رہے ہیں۔ مولانا فضل حق اپنے والد ماجد مولانا فضل امام خیر آبادی کو ایک خط مورخہ ۲۰ / ذی قعدہ ۱۲۳۴ھ کو لکھتے ہیں:[۱]

"خادم آپ سے کئی مرتبہ خطوط میں عرض کر چکا ہے کہ برادر بزرگ (منشی فضل عظیم) ناحیہ غریبہ آئے ہیں اور ناحیہ غریبہ کا انتظام درہم برہم ہے، آمدنی بند ہے۔ جب صاحب (ولیم فریزر) وہاں آئے اور انتظام درست کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور وہاں مستقل قیام کا ارادہ کیا تو صدر سے حکم ہوا کہ دارالخلافہ واپس آجائیں تو اب انشاء اللہ بڑے بھائی (منشی فضل عظیم) لوٹ آئیں گے۔ بہت جلد، میں نے یہ معتبر ذرائع سے سُنا ہے کہ مرکز سے حکم صادر ہو چکا ہے کہ وہ یہاں سے دکن کی طرف منتقل ہو جائیں ایک منصب جلیل پر۔ میں خدا کے فضل سے خوش حال اور مطمئن ہوں۔"

۱۸۴۵-۴۶ء میں منشی فضل عظیم دیوبند کے تحصیل دار تھے۔ جنوری ۱۸۴۶ء میں درد گردہ کی وجہ سے وہ ایک ماہ کی رخصت پر گئے تو قائم مقام تحصیلدار کی حیثیت سے مولوی نور الحسن کاندھلوی کا تقرر ہوا۔ وہ مفتی الٰہی بخش کے لائق فرزند اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے۔ مولوی نور الحسن کو ۴ / جنوری ۱۸۴۶ء کو تقرر نامہ ملا جس کے الفاظ یہ ہیں:[۲]

"رفعت و عوالی مرتبت فضیلت و کمالات دستگاہ مولوی نور الحسن صاحب! بعد ملاحظہ عرضی مولوی محمد فضل عظیم تحصیلدار دیوبند کے ان کو رخصت ایک ماہ کی حاصل ہوئی کہ وہ اس عرصہ میں معالجہ درد گردہ اپنے کا کریں گے اور آپ کو قائم مقام عہدہ تحصیل داری دیوبند پر مقرر کیا گیا۔"

ترقی کرتے کرتے منشی فضل عظیم سہارن پور کے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ ماہ جمادی الاولی

۱۔ بیاض مولانا فضل حق خیر آبادی، ص ۲۸

۲۔ حالات مشائخ کاندھلہ از مولانا احتشام الحسن (دہلی ۱۳۸۳ھ) ص ۱۴۶۔

۱۲۶۹ھ میں وہ اسی منصب پر فائز تھے[۱]

خیال یہ ہے کہ مولانا فضل حق جھجر سے ملازمت چھوڑنے کے بعد ۱۸۳۵ء تا ۱۸۴۰ء کے درمیان وہ سہارن پور اور ٹونک میں رہے کیونکہ ۱۸۴۰ء میں وہ سہارن پور سے جا چکے ہیں۔ مولانا فضل حق سہارن پور میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے۔ منشی امیر احمد مینائی لکھتے ہیں[۲] کہ مولانا فضل حق خیر آبادی الور، سہارن پور اور ٹونک سب جگہ معزز و مؤقر رہے۔

ہمارا خیال ہے کہ سہارن پور کی ملازمت میں ان کے بھائی فضل عظیم کی تحریک اور مشورہ ضرور رہا ہوگا۔ سہارن پور میں مولانا فضل حق کا قیام تقریباً دو سال رہا۔ مولانا عبدالشاہد خاں شروانی لکھتے ہیں:[۳]

"مولانا فضل حق کا سہارن پور میں قیام رہا دو سال تک کسی بڑے عہدے پر فائز رہے"

مولانا فضل حق خیر آبادی کے مقدمہ میں صفائی کے گواہ قادر بخش نے عدالت میں جو بیان دیا ہے اس میں اس نے کہا ہے:[۴]

"میرا خیال ہے کہ وہ (مولانا فضل حق خیر آبادی) سہارن پور میں سررشتہ دار تھے۔ لیکن کب؟ مجھے اس کا علم نہیں۔"

ایک دوسرے صفائی کے گواہ نبی بخش نے کہا کہ سہارن پور میں بھی انگریزی ملازمت میں تھے[۵]
ایک موقع پر مولانا فضل حق کے سب سے بڑے بھائی مولوی حافظ فضل الرحمن بھی نکوڑ

۱۔ وقائع کوہستان، ص ۷۶

۲۔ انتخاب یادگار از منشی امیر احمد مینائی (ناج المطابع لکھنؤ ۱۲۹۰ھ) ص ۲۹۲

۳۔ باغی ہندوستان، ص ۸۳

۴۔ ماہنامہ تحریک دہلی، جون ۱۹۶۰ء ص ۱۳-۱۴

۵۔ ماہنامہ تحریک دہلی، جون ۱۹۶۰ء ص ۱۳-۱۴

ضلع سہارن پور گئے تھے اور ان کی خاطر تواضع مولوی نور الحسن نے کی تھی، جس کے متعلق مولانا فضل حق اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"جناب اخوی صاحب قبلہ مولوی حافظ محمد فضل الرحمٰن صاحب حال تشریف فرمای خود بہ نکوڑ سپاس اخلاق و تواضع آں اعز بسیار نوشتہ بودند، آں اعزاز جزاء مامردم اند"[1]

مولوی فضل حق اپنے تلمیذ رشید مولوی نور الحسن نے یہاں کاندھلہ بھی گئے تھے اور ان بعض علمی آثار مولوی نور الحسن کے خاندان میں اب بھی محفوظ ہیں۔[2]

امیر الروایات کے راوی امیر شاہ خاں خورجوی سے ایک روایت منقول ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی نے ایک موقع پر فرمایا:[3]

"مولوی عبداللہ خاں کاندھلوی اور مولانا فضل حق صاحب کا سہارن پور میں امکان نظیر کے مسئلہ میں مناظرہ ہوا اور مولوی فضل حق صاحب کو بھرے مجمع میں الزام ہو گیا۔"

امیر الروایات کی اکثر روایتیں تاریخی اعتبار سے غلط ہیں۔ مولوی عبداللہ خاں کس حیثیت کے عالم تھے معلوم نہیں، تاریخیں اور تذکرے انکے ذکر سے خالی ہیں۔ نور الحسن راشد کاندھلوی نے امیر الروایات کے حوالے سے انھیں مفتی الٰہی بخش کا شاگرد بتایا ہے۔[4] اگرچہ مولوی الٰہی بخش کاندھلوی مولف "حالاتِ مشائخ کاندھلہ" نے مفتی صاحب کے تلامذہ ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

مولوی عبداللہ خاں کاندھلوی کا امکان نظیر کے مسئلے پر مولانا فضل حق کو الزام

---

[1] حالاتِ مشائخ کاندھلہ، ص ۱۴۶

[2] تبرکات (مجموعہ مکاتیب حاجی امداد اللہ و مولانا رشید احمد گنگوہی) مترجمہ و مرتبہ نور الحسن راشد کاندھلوی (مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ ۱۹۷۶ء) ص ۱۴۔ اور ہم نے یہ آثار علمی اپنے سفر کاندھلہ جنوری ۸۱ء میں خود دیکھے ہیں۔

[3] ارواح ثلاثہ (مجموعہ امیر الروایات، روایات الطیب و اشرف التنبیہ) مطبوعہ سہارن پور ۱۳۷۰ھ ص ۲،۴

[4] تبرکات، ص ۳۸ و شجرہ فیض علم مفتی الٰہی بخش مرتبہ نور الحسن راشد (کاندھلہ ۱۹۸۰ء)

دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔ سہارن پور اور کاندھلہ (ضلع مظفر نگر) کے تین بزرگوں کے نام مولانا فضل حق کے شاگردوں کی فہرست میں نظر آتے ہیں:

۱۔ مولوی عبدالرزاق سہارن پوری[۱]

۲۔ ادیب شہیر مولانا فیض الحسن بن علی بخش سہارن پوری (ف ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء)[۲]

۳۔ مولوی محمد اکبر بن مولوی نور الحسن کاندھلوی (ف ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء)[۳]

ٹونک

ریاست ٹونک، نواب امیر خاں کی شجاعت، بہادری، علو ہمتی اور اس دور کے سیاسی حالات کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ دسمبر ۱۸۱۷ء میں انگریزی حکومت اور امیر خاں کے درمیان معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے میں جنرل آکٹر لونی اور ریزیڈنٹ دہلی چارلس مٹکاف کی مرکزی حیثیت تھی بلکہ جنرل آکٹر لونی نے بذاتِ خود اس مہم کو سر کیا۔[۴]

دوسرے شرائط کے ساتھ امیر خاں کے بیٹے نواب وزیر الدولہ (ف ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء) کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ سرکار سے ملنا طے ہوا اور معاہدے کے تحت وہ کچھ مدت دہلی میں رہے۔ ولی عہد سلطان سلیم سے ان کے خاص روابط تھے۔[۵] دہلی کے علماء و عمائد

۱۔ مقالات طریقت از عبدالرحیم ضیا (حیدر آباد دکن ۱۲۹۲ھ) ص ۱۴۰

۲۔ نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۳۶۶۔

۳۔ حالات مشائخ کاندھلہ ص ۱۹۰

۴۔ ملاحظہ ہو امیر نامہ (اردو) از سعید احمد اسعد (مطبع محمدی ٹونک ۱۲۶۹ھ) ص ۵۵۸

۵۔ ایضاً ص ۵۸۶۔ ۵۸۷

سے بھی ان کا ربط و ضبط رہا ہوگا۔ وزیر الدولہ کا ریذیڈنسی سے براہ راست تعلق تھا لہٰذا وزیر الدولہ اور مولانا فضل حق کے تعلقات بھی اسی دور میں قائم ہوئے ہوں گے کیونکہ مولانا خیر آبادی ریذیڈنسی میں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز تھے۔

اس زمانہ میں راجپوتانہ کی ریاستوں سے معاہدات و معاملات کے سلسلے میں جنرل آکٹرلونی خاص طور سے متعین تھا۔ مولانا فضل حق کے دور رشتے دار منشی برکت علی خاں اور منشی کرم احمد جنرل آکٹرلونی سے وابستہ تھے اور بعض اہم اور خبر رسانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے[1]

۱۸۲۳ء میں نواب ٹونک کی طرف سے ریذیڈنسی میں جو وکیل تفضل حسین مقرر تھے وہ بھی مولانا فضل حق کے رشتے دار تھے۔ منشی برکت علی خاں، مولانا خیر آبادی کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے اور وکیل ٹونک تفضل حسین، منشی برکت علی خاں کے بھانجے تھے۔ ہم عصر وقائع نگار مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں:[2]

"۱۰ ربیع الاول ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۴ نومبر ۱۸۲۳ء بروز جمعہ تفضل حسین خاں پسر محفوظ علی خاں، برکت علی خاں کا بھانجا، جو امیر خاں کی وکالت میں جنرل صاحب (آکٹرلونی) کے پاس رہتا ہے، آیا۔ (وہ) ذہن روشن اور طبع رسا رکھتا ہے اور اس کے زور میں ہر جگہ ایک رشتہ نکال لیتا ہے۔ تحریر و تقریر اور سخن فہمی کا ملکہ رکھتا ہے۔"

یہ پس منظر ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی ۱۷ ربیع الاول ۱۲۴۰ھ کو نواب امیر خاں رئیس ٹونک کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتے ہیں جس میں اکتالیس اشعار ہیں اور اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

مُضِیًّا فقد وافی الی بشیر　　　　فاقبل نحوی جدۃ وحبوی

اس قصیدے سے مولانا فضل حق کا ٹونک جانا ثابت ہے۔ تمہید کی عبارت یہ ہے:

تقابلت امرہ بالاقبال ونحوت　　　　نحو حضرتہ بورود ذالک المثال

---

[1] علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد دوم، ص ۲۔　　[2] ایضاً، ص ۱۹۵

میں نے ان کے حکم کو قبول کیا اور میں نے ان کی بارگاہ کا قصد کیا اس کے آنے پر ذیل کے شعر سے بھی اس کی صراحت ہوتی ہے۔

فلبیتہ طوعا وطاوعت امرہ وسرجت افراسی وکدت اسیر

مولانا فضل حق نے لکھا ہے کہ نواب امیر خاں نے مجھے ٹونک بلانے کے لیے ایک قاصد اور حکم بھیجا چنانچہ میں نے ان کی دعوت قبول کی اور ان کی طرف چل پڑا۔ حالانکہ اعزّہ اور احباب مجھے اس سفر سے روک رہے تھے۔[1]

مولانا خیر آبادی ۱۸۲۴ء میں ٹونک تشریف لے گئے اور نواب امیر خاں کے مہمان ہوئے اور کچھ دنوں رہ کر وہ چلے گئے ہوں گے کیونکہ اس زمانہ میں وہ دہلی میں ریزیڈنسی سے وابستہ تھے شاید اسی وجہ سے نواب امیر خاں نے طلب کیا ہو۔ چونکہ اعزہ واحباب سفر سے روک رہے تھے اس سے خیال ہوتا ہے کہ کوئی سیاسی معاملت ہوگی۔

اکثر تذکرہ نگار مولانا فضل حق کا اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ وہ ٹونک میں ملازم رہے ہیں۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کا خیال ہے کہ مولانا فضل حق نواب وزیر الدولہ کے عہد میں ان کی طلبی پر ٹونک گئے۔[2] منشی امیر احمد مینائی لکھتے ہیں[3] کہ وہ الور، سہارن پور اور ٹونک سب جگہ معزز و موقر رہے۔ نادم سیتا پوری رقم طراز ہیں:[4]

"ریاست ٹونک میں خیر آباد کے کئی بزرگ ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ اس سلسلہ میں کچھ دنوں ٹونک سے بھی منسلک رہے۔"

۱۔ بیاض مولانا فضل حق خیر آبادی، ص ۱۱۸

۲۔ مولانا فضل حق و عبد الحق از مفتی انتظام اللہ شہابی (نظامی پریس بدایوں) ص ۸ ؛ حیات علامہ فضل حق خیر آبادی اور ان کے سیاسی کارنامے از مفتی انتظام اللہ شہابی (دائرۃ المصنفین کراچی ۱۹۵۶ء) ص ۲۶

۳۔ انتخاب یادگار، ص ۲۹۲۔

۴۔ غالب نام آورم از نادم سیتا پوری (لاہور ۱۹۷۰ء) ص ۱۰۷

ریاست ٹونک کے تاریخی مآخذ البتہ مولانا فضل حق کے ٹونک کے قیام اور ملازمت کے ذکر سے خالی ہیں[1]

مولانا فضل حق کے صاحبزادے شمس العلماء مولانا عبدالحق ٹونک میں ضرور رہے اور ٹونک فضل حق کے علوم وافکار کا مرکز اور نشر گاہ رہا ہے۔ مولانا عبدالحق کے علاوہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد مولوی حکیم دائم علی سرکاری طبیب ریاست ٹونک (ف ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۸ء) بھی خیرآبادی افکار کی نشر و اشاعت کا ذریعہ رہے ہیں اور مولانا حکیم برکات احمد ابن حکیم دائم علی (ف یکم ربیع الاول ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) کی ذات بابرکات تو ان علوم کی اشاعت کے لیے وقف تھی۔ علامہ سلیمان ندوی لکھتے ہیں:[2]

"والی ٹونک ان کی پوری قدردانی فرماتے تھے اور ان کو اپنی ریاست کا فخر سمجھتے تھے۔ دور دور کے طلباء آکر ان کے حلقۂ تعلیم میں شریک ہوتے تھے۔ اور کامیاب ہوکر واپس جاتے تھے۔"

مولانا حکیم برکات احمد نے رئیس ٹونک کی قدرشناسی سے ٹونک کو علم وفن کا مرجع بنا دیا۔ مولوی حکیم محمد احمد مرحوم (ف ۴ فروری ۱۹۳۲ء) نے اپنے دادا مولوی حکیم دائم علی اور اپنے والد مولانا حکیم برکات احمد کے حالات لکھے ہیں۔ ان سوانحی نوشتوں میں بھی کہیں مولانا فضل حق کے ٹونک میں قیام اور ملازمت کا ذکر نہیں ہے[3]

۱۔ اس سلسلے میں امیر نامہ (اردو) دور ایام از علی اصغر اور تاریخ ٹونک از اصغر علی ابر قابل ذکر ہیں۔

۲۔ یادِ رفتگاں از علامہ سلیمان ندوی (مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۸۳ء) ص ۸۷۔

۳۔ حکیم محمد احمد نے سوانح ابوالبرکات حکیم دائم علی خاں (تالیف ۱۳۳۹ھ) اور سوانح عمری مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی لکھی ہیں جو حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کے ذخیرۂ علمیہ میں محفوظ ہیں اور ہماری نظر سے گزری ہیں۔

رام پور

مولانا فضل حق خیرآبادی نواب محمد سعید خاں کے سربرآرائے حکومت ہونے کے بعد رام پور تشریف لے گئے۔ نواب محمد سعید خاں ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء کو تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے زمامِ ریاست سنبھالنے کے بعد بعض تجربہ کار اہل کار بلائے، علما و فضلا کی قدر دانی فرمائی۔ نامور علما ان کے دور میں رام پور پہنچے۔ بشیر حسین زیدی سابق چیف منسٹر رام پور لکھتے ہیں:[1]

"انتظامی امور سے فارغ ہونے کے بعد نواب جنت آرام گاہ نواب محمد سعید خاں نے سرپرستی علم و ادب کی طرف قدم بڑھایا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی، ملک الشعراء مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی، حکیم احمد خاں فاخر رام پوری اور دیگر علما و ادبا مختلف کتابوں کے ترجمہ و تالیف پر مامور ہوئے۔"

اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ ۱۸۴۰ء میں مولانا فضل حق رام پور آ گئے تھے کیونکہ منشی امیر احمد مینائی نے مولانا خیرآبادی کے رام پور کے قیام کی مدت آٹھ سال لکھی ہے[2]۔ وہ ۱۸۴۷ء میں رام پور سے لکھنؤ جا چکے تھے۔ لہٰذا مولانا کا قیام رام پور ۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۷ء قرار پاتا ہے۔ مؤلف تذکرۂ کاملانِ رام پور اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات لکھتے ہیں:[3]

"مولوی نصیر الدین خاں رام پوری کے مرضِ موت میں نواب جنت آرام گاہ (محمد سعید خاں) نے مولوی فضل حق خیرآبادی کو بلایا۔ آپ (مولوی نصیر الدین خاں) کے ایک دوست مولوی

۱۔ مکاتیبِ غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی (رام پور ۱۹۴۹ء) ص نر

۲۔ انتخاب یادگار، ص ۲۹۲

۳۔ تذکرۂ کاملانِ رام پور، ص ۴۱۷

جلال الدین آپ کے ہم سایہ تھے۔ ان سے کہا کہ اگر صحت ہوگئی تو میں ان سے گفتگو کروں گا مگر تم ان سے گفت گو ہرگز نہ کرنا اس لیے کہ وہ نہایت زبردست معقولی ہیں۔ مولوی فضل حق صاحب جس وقت رام پور پہنچے تو آپ کا انتقال ہو چکا تھا[1]۔ مولوی فضل حق صاحب آپ کے مکان پر فاتحہ خوانی کو آئے اور بہت افسوس سے کہتے تھے کہ میرا آنا نواب صاحب کے حکم سے ہوا ہے مگر زیادہ تر شوق یہاں آنے کا مولوی صاحب مرحوم (مولوی نصیر الدین خاں) کی ملاقات کے لیے تھا۔"

مؤلف تذکرہ کاملانِ رام پور لکھتے ہیں[2]:

نواب محمد سعید خاں بہادر جنت آرام گاہ نے جناب نواب یوسف علیخاں صاحب بہادر فردوس مکان کی تعلیم کے واسطے بسفارش عبدالرحمٰن خاں، مولوی جلال الدین نابینا اور مولوی عبدالعلی خاں ریاضی داں اور مولوی محمد رام پوری کو مقرر فرمایا۔ ہر صاحب اپنے اپنے وقت پر حمد اللہ کے متعلق مختلف تقریریں کیا کرتے تھے۔ فردوس مکان (نواب یوسف علی خاں) کی تسکین خاطر ان تینوں علماء کے بیان سے نہ ہوئی تو مولانا فضل حق دہلی سے بلائے گئے اور مولانا نے تعلیم شروع کرائی۔"

حافظ احمد علی خاں شوق نے مولوی عبدالعزیز خاں کے حالات میں لکھا ہے[3]:

"نواب فردوس مکاں (نواب یوسف علی خاں) نے مولوی فضل حق خیر آبادی سے یہ شرط کی تھی کہ کتاب کی عبارت ہم نہیں پڑھیں گے۔ قرأت کتاب پر مولوی عبدالعزیز خاں کا تقرر ہوا۔"

۱؎ مولوی نصیر الدین کا سال انتقال تذکرۂ کاملان رام پور میں ۱۲۶۶ھ لکھا ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو ان کا انتقال ۱۲۵۶ھ میں ہونا چاہیے کیونکہ مولانا خیر آبادی کی رام پور میں آمد اسی سال ہوئی۔ ص ۳۰۔

۲؎ تذکرۂ کاملان رام پور، ص ۲۲۸۔

۳؎ تذکرۂ کاملان رام پور، ص ۲۲۳-۲۲۴

مولانا فضل حق کے سپرد[1] نواب محمد سعید خاں کے صاحبزادگان

۱۔ نواب محمد یوسف علی خاں ولی عہد (ف ۱۲۸۱ھ)

۲۔ محمد کاظم علی خاں (ف ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء)

ہوئے اور ان دونوں بھائیوں نے استفادہ کیا۔ حکیم نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں[2]:

"نواب یوسف علی خاں علوم کی طرف بہت رغبت رکھتے تھے۔ کاملوں سے صحبت رہتی تھی۔ علوم عقلیہ منطق و حکمت میں اعلیٰ دستگاہ تھی اور ان علوم کو مولانا فضل حق خیر آبادی سے حاصل کیا تھا"۔

جب نواب محمد یوسف علی خاں اور صاحبزادہ محمد کاظم علی خاں ریاست کے کاموں میں مشغول رہنے لگے تو نواب محمد کلب علی خاں ابن نواب محمد یوسف علی خاں (ف ۱۸۸۷ء) اور صاحبزادہ فدا علی خاں ابن محمد کاظم علی خاں کی تعلیم کا سلسلہ مولانا فضل حق سے متعلق ہو گیا۔

مرزا نصیر الدین رام پوری (ف ۱۹۰۹ء) اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں[3]:

"اس زمانہ میں مولوی عبد الحق خلف مولوی فضل حق و مولوی سلطان حسن خاں[4] ابن مولوی احمد حسن خاں رئیس بریلوی و صدر الصدور، نواب محمد کلب علی خاں کے ہم مکتب تھے"۔

نواب محمد سعید خاں نے مولانا فضل حق کو محکمہ نظامت اور مرافعہ عدالتین پر مقرر کیا۔ حکیم نجم الغنی

---

[1] وقائع نصیر خانی مترجمہ و مرتبہ محمد ایوب قادری (ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۱ء) ص ۳۰

[2] اخبار الصنادید جلد دوم از حکیم نجم الغنی خاں رام پوری (نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۸ء) ص ۲۴

[3] وقائع نصیر خانی، ص ۳۱

[4] مولوی سلطان حسن خاں مولانا فضل حق کے خاص شاگرد تھے۔ صدر الصدور کے منصب سے پنشن پائی۔ ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو معارف اعظم گڑھ اگست ۱۹۶۷ء ص ۱۰۹

خاں رام پوری لکھتے ہیں :[1]

"مولوی فضل حق صاحب فاروقی خیر آبادی ابن مولانا فضل امام صاحب کو آپ نے بلا کر نوکر رکھا۔ محکمہ نظامت اور پھر مرافعہ عدالتین[1] پر مامور کیا۔ مولوی صاحب نے ہدیہ سعیدیہ فی حکمۃ الطبیعیہ زبان عربی میں نواب صاحب کے نام نامی پر معنون کیا۔"

منشی امیر احمد مینائی رقم طراز ہیں :[2]

"اس دار الریاست رام پور میں پہلے محکمہ نظامت اور پھر مرافعہ عدالتین پر مامور تھے۔ جناب مستطاب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکاں انار اللہ برہانہم کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے اور بندگانِ حضور پُر نور دام ملکہم و اقبالہم (نواب کلب علی خاں) نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ سال بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے تھے۔ یہاں سے تشریف لے گئے۔"

مولانا فضل حق خیر آبادی نے ہدیہ سعیدیہ میں نواب محمد سعید خاں اور نواب یوسف علی خاں کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کو یوں معنون کیا ہے :[3]

وبعد فهذه جملة جميلة في الحكمة	اما بعد یہ کتاب حکمت طبیعیہ میں ایک خوبصورت
الطبيعة يزري بزهوها بانوار الربيعة	ہے جس سے شگوفہ ہائے بہار کا سماں سامنے آ
لطفت بها ارتجالا ونمقتها استعجالا و	جاتا ہے اسے میں نے قلم برداشتہ اور عجلت

---

[1] دیوانی اور فوجداری کی دونوں عدالتیں مراد ہیں۔ (اخبار الصنادید جلد دوم ص ۲۱)

[2] انتخاب یادگار ص ۲۹۲

[3] ہدیہ سعیدیہ از مولانا فضل حق خیر آبادی (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء) ص ۶-۸

خدمت بها حضرة من خصّه الله من
عموم الامم بالفضل العمم فيعمم
العميم الكرم صاحب السيف القلم
مروج الحكم والحكم وهاب النعم
والنعم كاشف الهموم بعيد الهمم
مرّ الباس حلو الشيم مجلى الظلم والظلم
سعيد الجدّ والعلم كاشف الضير
والضر ناشر الدّر والدّر محمد سعيد
خان بهادر لا زالت ايام دولته ايديه
والاقطار بقطار جود نديه و
حضرت نجله الرشيد السعيد بن
سعيد العميد المعيد الجيد
الجيد ذى الجود والتقريب
والعزم البعيد والراى السديد
والبطش الشديد والعديد
والكرم المديد والجد القديم
والجد الجديد والخلق
المليح الخلق الحلو والاباء
المر محمد يوسف على خان
بهادر لازالت سدة
السنيه ۔

ہیں لکھا ہے اور یہ میں نے اس ذات گرامی
کو نذر کیا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام اقوام
میں سے اپنے فضل عام سے مخصوص فرمایا ہے
اور کرم عام سے سرفراز کیا ہے۔ صاحب سیف و
قلم، احکام اور حکمتوں کے رائج کرنے والے
نعمتوں کے بخشنے والے، غموں کے دور کرنے
بلند ہمت، نبرد آزما، خوش اخلاق، تاریکیوں
اور مظالم کے دور کرنے والے، نام اور تقدیر
کے اعتبار سے سعید، سختیوں اور مصیبتوں کے
دور کرنے والے، موتی اور حسن عمل لٹانے
والے محمد سعید خاں بہادر اللہ تعالیٰ ان کے
عہدِ حکومت کو ہمیشہ برقرار رکھے اور ان کے
بارانِ سخاوت کے تسلسل کو باقی رکھے اور
ان کے فرزند رشید و سعید، سردار، طاقت والے
بزرگ، صاحب ایجاد، صاحب سخاوت، صاحب
عزم، صاحب رائے، صائب اور سخت پکڑ
والے، کثیر ساز و سامان والے، کرم بے نہایت
والے، ہمیشہ سے عظمت والے، اچھے اخلاق
کے مالک، شیریں اخلاق والے، کڑواہٹ
کو ناپسند کرنے والے محمد یوسف علی خاں
بہادر اللہ تعالیٰ ان کے آستانے کو باقی رکھے۔

ہدیۂ سعیدیہ میں سب سے پہلے حکمت کی تعریف اور درجہ بندی کی گئی ہے حکمت کے معنی ہیں اشیاء کی اصل حقیقت کا علم حاصل کرنا، جہاں تک کہ وہ انسان کے لیے ممکن الحصول ہے اور ان کے افعال کو انجام دینا جو مکمل انسان بننے میں مدد دیتے ہیں۔ اشیاء کی دو قسمیں ہیں (۱) حکمۃ العملیۃ جو ہمارے اختیار میں ہے یعنی ہمارے اعمال اور حکمۃ العملیۃ کی تین ذیلی قسمیں ہیں۔ (۱) تہذیب اخلاق (۲) تدبیر المنزل اور (۳) سیاست المدنیہ۔

جو چیزیں انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔ ان سے متعلق علم حکمت کو حکمۃ النظریہ کہتے ہیں اور اس کی تین ذیلی تقسیمیں کی گئی ہیں (۱) علم الالٰہی (۲) علم الریاضی (۳) علم الطبیعی اور علم الطبیعی کو مزید آٹھ شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے :-

(۱) علم السماء الطبعی ۲۔ علم السماء العالم ۳۔ علم الکون والفساد ۴۔ علم الفعل والانفعال
۵۔ علم الآثار العلویہ ۶۔ علم النفس ۷۔ علم النباتات ۸۔ علم الحیوان

یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین حصوں پر مشتمل ہے جن کا نام فنون رکھا گیا ہے۔ مقدمے میں فاضل مصنف نے طبیعیات کے ان مسائل پر بحث کی ہے جو دراصل فلسفہ کے اعلیٰ مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلا حصہ متعدد ذیلی شاخوں پر منقسم ہے اور ان میں خصوصیات اور واردات پر بحث کی گئی ہے جو تمام اجسام کا لوازمہ ہیں خواہ وہ سماوی ہوں یا ارضی۔

دوسرا حصہ بھی کئی ذیلی شاخوں پر تقسیم کیا گیا ہے اور یہ اجرام سماوی سے متعلق ہے اس لیے اس کا عنوان الفلکیات رکھا گیا ہے[1]

تیسرا حصہ عنصریات یعنی مادی عالم سے متعلق ہے اور اس موضوع میں طبیعیات کی باقی ماندہ شاخیں شامل ہیں۔ یہ حصہ بھی کئی ذیلی شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا ذیلی حصہ تخلیق اور تخریب

---

[1] الہدیۃ السعیدیہ، ص ۶۶۔

سے متعلق ہے۔

فاضل مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ زمین حرکت نہیں کرتی بلکہ ساکن ہے۔ جیسا کہ قدیم فلاسفہ کا ایک گروہ تصور کرتا تھا[۱]

اس کے بعد مصنف نے چاروں عناصر کی باہم تبدیل پذیری اور باہم تحلیل پر بحث کی ہے۔ اور چاروں عناصر کے توازن کو اس جسد کا مزاج کہا ہے۔ پھر دھواں، بخارات، ابر، بارش اولے، گرج، بجلی، شہاب ثاقب، قوس قزح، ہالہ اور آندھی وغیرہ پر بحث کی ہے۔[۲] ان مباحث کے بعد معدنیات کی بحث ہے[۳]۔ اور پھر نباتات[۴] اور حیوانات کا بیان ہے[۵]۔ آخر میں نفسیات پر بحث ہے[۶] اس کے بعد کتاب ختم ہو جاتی ہے[۷]

مولانا فضل حق کے نامور فرزند مولانا عبدالحق نے ہدیۂ سعیدیہ کا تکملہ ہدیۃ الہدیہ اور شاگرد رشید مولوی عبداللہ بلگرامی نے "التحفۃ العلیہ" کے نام سے اس کا حاشیہ لکھا، مفتی سعد اللہ مراد آبادی (ف ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء) نے ہدیۂ سعیدیہ پر بعض اعتراضات کیے تھے۔ مولوی سلطان حسن خاں بریلوی نے ان اعتراضوں کے جواب میں ایک رسالہ لکھا، جو اسی زمانے میں چھپ بھی گیا تھا۔ راقم الحروف کے کتب خانے میں یہ رسالہ محفوظ ہے اور ہدیۂ سعیدیہ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۸ھ کے آخر میں (ص ۲۴ تا ۴۸) یہ رسالہ شامل ہے[۸]

---

[۱] الہدیۃ السعیدیہ ص ۸۴ و ما بعد۔ [۲] الہدیۃ السعیدیہ ص ۱۲۴ و ما بعد۔ [۳] ایضاً ص ۱۳۲ و ما بعد۔ [۴] ایضاً ص ۱۳۵۔ [۵] ایضاً ص ۱۵۵۔ [۶] ایضاً ص ۲۱۲۔ [۷] ملاحظہ ہو عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ از ڈاکٹر زبید احمد (ترجمہ شاہد حسین رزاقی) (لاہور ۱۹۷۳ء) ص ۱۵۰-۱۵۶۔

[۸] یہ رسالہ مولانا فضل حق کی نظر سے گذرا ہے اور انھوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۶۵ھ بنام مفتی حسن بریلوی میں اس کا ذکر کیا ہے اور مولانا فضل حق کا یہ خط (خطی صورت میں) نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی میں محفوظ ہے۔ ہدیۂ سعیدیہ کا پہلا اڈیشن مطبع صدیقی بریلی سے ۱۲۸۳ھ میں شائع ہوا۔

برصغیر پاک و ہند کے اکثر عربی مدارس میں ہدیہ سعیدیہ شامل نصاب رہا ہے مولوی عبدالشاہد خاں شروانی نے ہدیہ سعیدیہ کی تقریب تالیف کے بارے میں لکھا ہے[1]

"خلف الرشید مولانا عبدالحق کو ریزیڈنسی آتے جاتے وقت ہاتھی یا پالکی میں جو سبق دیے جاتے تھے۔ ہدیہ سعیدیہ ان ہی کا مجموعہ ہے۔ علامہ (فضل حق) روز ایک سبق تحریر فرما لیتے تھے۔ وہی راستے میں صاحبزادے کو پڑھا دیتے تھے۔ فلکیات تک یہی سلسلہ رہا جب معتدبہ حصہ ہو گیا تو تلامذہ نے کتابی شکل دینے پر اصرار کیا۔ علامہ نے طلبہ کی آرزوؤں کو پامال نہ کرتے ہوئے تصنیفی حیثیت سے قلم اٹھایا... سعادت مند فرزند کی مناسبت ہی سے ہدیہ سعیدیہ نام بھی رکھا گیا ہے۔ نواب محمد سعید خاں والی رام پور کے نام کا لحاظ بھی ضمناً پیش نظر تھا۔"

عبدالشاہد خاں شروانی نے اپنے اس بیان کی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ کتاب کے فاضل مؤلف مولانا فضل حق نے بالصراحت نواب محمد سعید خاں اور نواب محمد یوسف علی خاں کے نام پر کتاب کو معنون کیا ہے۔ اس کے تکملہ نگار مولانا عبدالحق اور اس کے مرتب و محشی مولوی عبداللہ بلگرامی اور مزید مولوی سلطان حسن خاں بریلوی، کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ سراسر مولوی عبدالشاہد خاں کی من گھڑت کہانی ہے کیونکہ مولانا عبدالحق ۱۲۴۴ھ / ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۵ھ / ۱۸۳۱ء میں مولانا فضل حق ریزیڈنسی کی ملازمت سے مستعفی ہوئے[2] اور ملازمت سے علیحدگی کے وقت مولانا عبدالحق کی عمر بمشکل سال سوا سال ہو گی۔ لہٰذا یہ کہانی تمام تر بے بنیاد ہے۔ کاش مندرجہ بالا سطور لکھتے وقت مولوی عبدالشاہد خاں 'ہدیہ سعیدیہ' کی ابتدائی چند سطریں ملاحظہ فرما لیتے تو ایسی بات نہ لکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی

---

[1] - باغی ہندوستان ص ۱۲۸

[2] فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون از حکیم محمود احمد برکاتی (برکات اکیڈمی کراچی ۱۹۷۵ء) ص ۲۰

کتاب باغی ہندوستان میں اکثر بے بنیاد باتیں لکھ دی ہیں کہ جن کا سر ہے نہ پیر۔

ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

رام پور میں مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علماء سے مباحثات و مذاکرات بھی ہوتے تھے، مؤلف "تذکرۂ کاملان رام پور" نے ایک لطیفہ نقل کیا ہے:[1]

"مولوی خلیل الرحمٰن سوانی نے نواب یوسف علی خاں سے کہا کہ میں ہر چیز قرآن شریف نکالتا ہوں۔ یہ ذکر نواب صاحب نے مولوی فضل حق خیر آبادی سے کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ ان سے فرما دیں کہ معجون فلاسفہ کے اجزا تو قرآن سے نکال دیجیے۔ چنانچہ دوسری ملاقات میں یہی سوال کیا۔ مولوی خلیل الرحمٰن سخت پریشان ہوئے۔ ان کو بھی معلوم ہو گیا کہ یہ اشارہ مولوی فضل حق کا تھا۔ اسی لیے ایک روز نواب صاحب کے سامنے مولوی فضل حق سے اصول میں گفتگو کرنے لگے۔ مولوی فضل حق کھینچ تان کر ان کو منطق میں پکڑ لائے اور بند کر دیا، اسی روز مولوی فضل حق نے کتبِ اصول کو دیکھنا شروع کر دیا۔"

مولوی عبدالجلیل نعمانی رام پوری بن شیخ عبدالغنی اپنے ایک مضمون "تذکرۂ علمائے رام پور" میں لکھتے ہیں:[2]

"مولانا جلال الدین معقولی مرحوم استاد نواب خلد مکاں یوسف علی خان ... نہایت ذکی تھے، مناظرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مولانا فضل حق خیر آبادی جو علوم معقولہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان سے ہمیشہ مناظرۂ علمی نہایت لطف کے ساتھ ہوا کرتا تھا اور بڑے بڑے علما مجلسِ مناظرہ میں حاضر رہتے۔"

شاہ غوث علی قلندر پانی پتی (ف ۱۸۸۰ء) مولانا فضل امام خیر آبادی کے شاگرد اور سیاح معرفت تھے۔ جس زمانے میں مولانا فضل حق کا قیام رام پور میں تھا تو شاہ غوث علی گھومتے گھامتے

---

[1] تذکرۂ کاملان رام پور ص ۱۲۳۔ [2] ماہنامہ "البلاغ"، بمبئی، فروری ۱۹۵۷ء ص ۲۷۔

وہاں پہنچے مولانا نے شاہ صاحب کو اپنا مہمان رکھا۔ شاہ غوث علی کا بیان ہے:[۱]

"جب ہم دوبارہ رام پور پہنچے تو سرائے میں ٹھہرے۔ مولوی فضل حق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نہایت محبت و عنایت سے پیش آئے اور اپنے نوکر سے کہا کہ جاؤ آپ کا اسباب اٹھا لاؤ۔ میں نے کہا کہ حضرت برائے خدا مجھے وہیں رہنے دیجئے کہ بہت آرام سے ہوں۔ کہا اچھا جہاں آپ خوش رہیں لیکن بھٹیاری کو کہلا بھیجا کہ ان کے خرچ کا حساب ہمارے ذمے ہے اگر پانچ روپے روز بھی اُٹھیں تو کچھ مضائقہ نہیں ہم دیں گے لیکن یہ شرط ہے کہ میاں صاحب بلا اجازت ہمارے کہیں چلے نہ جائیں ... غرض ہم رامپور میں مہینے بھر تک مولوی صاحب کے مہمان رہے۔"

شاہ غوث علی قلندر نے مولانا فضل حق خیرآبادی کی زندگی کے کئی دلچسپ واقعات بھی نقل کیے ہیں[۲]۔ شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ قیام رام پور کے زمانے میں مولانا فضل حق خیرآبادی قصبہ آنولہ سے ہوتے ہوئے بدایوں گئے تھے۔ آنولہ میں حکیم سعادت علی خاں مدار المہام رام پور (ف ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء) کے یہاں قیام رہا تھا[۳]۔ بدایوں میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی آمد کے متعلق مؤلف اکمل التاریخ لکھتے ہیں:[۴]

"حضرت سیف اللہ المسلول قدس سرہٗ (مولانا فضل رسول بدایونی) سے آپ (مولانا فضل حق خیرآبادی) کو نہایت خلوص و عقیدت تھی۔ ایک زمانے میں بدایوں بھی تشریف لائے تھے۔ اکثر اوراد و اشغال کی اجازتیں حاصل

---

[۱] تذکرۂ غوثیہ مرتبہ شاہ گل حسن قادری (اللہ والے کی قومی دکان لاہور) ص ۱۲۴

[۲] تذکرہ غوثیہ ص ۱۲۵، ۲۴۵، ۲۶۰، ۳۷۱۔

[۳] مولانا عبدالمجید قادری (ف ۱۹۴۳ء) اور حکیم معظم علی خاں رئیس آنولہ (ف ۱۹۵۳ء) نے مولانا فضل حق خیرآبادی کے آنولہ آنے کا اکثر ذکر کیا بلکہ حکیم صاحب کے کتب خانے میں مولانا خیرآبادی کے بعض آثارِ علمیہ بھی محفوظ تھے۔ [۴] اکمل التاریخ جلد اول از مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری (قادری پریس بدایوں) ص ۸۹۔

کی تھیں۔ مدرسہ عالیہ قادریہ میں مقیم رہے تھے۔"

آخر میں ہم مولانا فضل حق خیرآبادی کے ان تلامذہ کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں جنھوں نے رام پور میں مولانا سے تحصیل علم کی۔

۱۔ شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی (ف ۱۳۱۶ھ)
۲۔ نواب محمد یوسف علی خاں ابن نواب محمد سعید خاں (ف ۱۲۸۱ھ)
۳۔ نواب محمد کلب علی خاں ابن نواب محمد یوسف علی خاں (ف ۱۸۷۸ء)
۴۔ صاحبزادہ محمد کاظم علی خاں ابن نواب محمد سعید خاں (ف ۱۲۹۹ھ)
۵۔ صاحبزادہ فدا علی خاں ابن محمد کاظم علی خاں۔
۶۔ مولوی ہدایت اللہ خاں ولد رفیع اللہ خاں رام پوری (ف ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) ص ۴۵۲[1]
۷۔ ملّا نواب ولد سعداللہ خاں رام پوری (ف ۱۳۰۹ھ) ص ۴۲۳-۴۲۴
۸۔ مولوی محمد موسیٰ خاں ولد احمد خاں رام پوری (ف غالباً ۱۳۳۳ھ) ص ۴۴
۹۔ مولوی حکیم محمد فیاض خاں ولد مولوی بشارت اللہ خاں رام پوری (ف ۱۲۷۲ھ) ص ۳۶۷
۱۰۔ مولوی عبدالعلی خاں ریاضی داں ولد یوسف خاں رام پوری (ف ۱۳۰۳ھ) ص ۲۲۸
۱۱۔ مولوی نورالنبی ولد مولوی محمد اسحٰق مدرس مدرسۂ عالیہ رام پور (ف تقریباً ۱۲۸۷ھ) ص ۲۲۸-۴۳۵؟
۱۲۔ مولوی عبدالعزیز خاں ولد حاجی حجرہ باز خاں مدرس مدرسۂ عالیہ رام پور ص ۲۲۳-۲۲۴
۱۳۔ مولوی سلطان حسن خاں ولد مولوی احمد حسن خاں صدرالصدور بریلوی (ف ۱۲۹۹ھ)
۱۴۔ مولوی ہدایت علی بریلوی مدرس اوّل مدرسہ عالیہ رام پور (ف ۱۳۲۳ھ)
۱۵۔ مولوی حکیم الٰہی بخش قادری ولد اشرف الحکما حکیم عظیم اللہ قادری ساکن قصبہ آنولہ (ف ۱۳۲۰ھ)[2]

---

[1] یہ تمام صفحات تذکرۂ کاملان رام پور کے ہیں۔ [2] مظہر العلماء از مولوی محمد حسین بن سید بخشش علی ساکن سید پور ضلع بدایوں المتوفی ۱۹۱۸ء (العلم کراچی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء) ص ۳۵۔

۱۶۔ مولوی احمد حسن مراد آبادی محشی شفائے قاضی عیاض (ف ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء)[۱]

۱۷۔ مولوی حکیم محمد حسن ولد شیخ کرامت علی امروہوی (ف ۱۳۲۳ھ)[۲]

۱۸۔ مولوی عبدالعزیز سنبھلی (۱۲۷۷ھ تک حیات تھے) ص ۲۲۴

۱۹۔ مولوی عبدالرشید غازی پوری۔ بروایت امیر شاہ خاں خورجوی (ارواح ثلاثہ ص ۳۵۵)

والی اودھ واجد علی شاہ کے تخت نشین ہونے پر مولانا فضل حق خیرآبادی لکھنؤ تشریف لے گئے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کی دو نسلوں کا تعلق بھی ریاست رام پور سے رہا شمس العلماء مولانا عبدالحق خیرآبادی نواب کلب علی خاں کے دور میں حاکم مرافعہ اور مدرسہ عالیہ رام پور کے افسر رہے۔ جب نواب حامد علی خاں رئیس بنے تو انھوں نے بھی بلایا اور شرف تلمذ حاصل کیا پھر ان کے بیٹے مولوی اسدالحق مدرسہ عالیہ رام پور کے مدرس اعلیٰ رہے۔ ان کا رام پور ہی میں ۴ اگست ۱۹۰۰ء کو انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔[۳]

لکھنؤ

۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ سریرآرائے حکومت ہوئے۔[۴] خیال یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے فوراً بعد مولانا فضل حق خیرآبادی وارد لکھنؤ ہوئے ہوں گے۔ مولانا فضل حق جس زمانے میں دہلی میں سرکاری ملازمت سے منسلک تھے، اس وقت ان کے روابط لکھنؤ کی دو معروف شخصیتوں سے ہوئے یعنی شیخ احمد عرب یمنی شروانی صاحب نفحۃ الیمن و مناقب حیدریہ و صدر مدرس مدرسۂ عالیہ

---

[۱] اکمل التاریخ جلد اول ص ۸۹۔ [۲] تذکرۃ الکرام از مولوی محمود احمد عباسی (جید برقی پریس دہلی ۱۹۳۲ء) ص ۳۰۲-۳۰۶۔ [۳] تذکرۂ کاملان رام پور ص ۳۶-۳۷۔ [۴] قیصر التواریخ (حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

کلکتہ (ف ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء)[۱]

۲۔ مفتی خلیل الدین خاں بہادر سفیر شاہ اودھ بدر بار گورنر جنرل (ف ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء)[۲]

شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے حبیب سلطان غازی الدین حیدر (ف ۱۸۲۷ء) کی تعریف وتوصیف میں ایک کتاب "مناقب حیدریہ" لکھی تو انھوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ مولانا فضل حق خیرآبادی کی خدمت میں بھی بھیجا، مولانا نے رسید سے مطلع کیا اور شیخ یمنی کی تعریف اور کتاب کی تقریظ میں ایک قصیدہ بھی لکھا۔ یہ دونوں تحریریں ربیع الآخر ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) کی ہیں اور دونوں محفوظ ہیں[۳]

شیخ احمد عرب شروانی اور مولانا فضل حق کے درمیان گہرے روابط تھے۔ طرفین سے علمی وادبی تحائف کے تبادلے بھی ہوتے تھے۔ نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر دہلوی، (ف ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء)[۴] اپنے ایک مکتوب بنام شیخ احمد عرب شروانی میں لکھتے ہیں[۵]

حسب الحکم رسالہ جناب فضیلت مآب	آپ کے حسب الحکم مولانا فضل حق کا
الفائق علی الاماجد بمحاسن افضالہ والسابق من	رسالہ لکھوالیا ہے لیکن ابھی تک اس کی صحت
الاقران بجرائم افعالہ الفاروق بین الباطل	نہیں ہوئی ہے۔ جناب موصوف (مولانا
والحق مولوی محمد فضل حق دامت برکاتہ نویسانیدہ	فضل حق) تصحیح میں مصروف ہیں جیسے ہی

(حاشیہ صفحہ سابقہ) جلد دوم ص ۴ و تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۲۰

[۱]۔ ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۱۰۵۔ نزہۃ الخواطر جلد ہفتم ص ۳۴

[۲]۔ ملاحظہ ہو تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۴۷ - ۱۵۱۔ [۳]۔ بیاض مولانا فضل حق خیرآبادی ص ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۷۔ [۴]۔ دلی کے نامی گرامی رئیس، غالب سے تعلقات تھے، نامی تخلص تھا۔ ملاحظہ ہو خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۸۲ - ۸۷ و مقدمہ دیوان نامی (مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری) مکتبہ ادبستان سری نگر ۱۹۶۷ء

[۵]۔ مراسلات احمدی (خطی) مملوکہ محمد ایوب قادری ص ۱۰۶ - ۱۰۷

لیکن ہنوز بحلل صحت مزین نگمہ دیدہ۔ ہر گاہ بزیور تصحیح جناب موصوف کہ باآں مصروف از محلی خواہد گشت بخدمت اقدس ابلاغ خواہد شد۔ زیورِ تصحیح سے آراستہ ہو گا، آپ کی خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔

مفتی خلیل الدین خاں، قاضی نجم الدین علی خاں بہادر اشرف جنگ کے صاحبزادے علم و فضل میں مشہور زمانہ اور علم ریاضی میں ماہر یگانہ تھے۔ ان کے والد قاضی نجم الدین علی خاں سرکار کمپنی کی طرف سے قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ اودھ کی حکومت میں اعلیٰ مناصب پر سرفراز رہے اور گورنر جنرل کے دربار میں کلکتہ میں سفیر مقرر ہوئے۔ مفتی خلیل الدین سرکار اودھ کے اہم منصب دار تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے ان سے راہ و رسم پیدا کی اور مراسلت کا آغاز کیا۔ اپنے اشعار ان کی خدمت میں ارسال کیے۔ اس کے جواب میں انھوں نے بھی اپنا کلام بھیجا چنانچہ مفتی خلیل الدین اپنے مکتوب بنام مولانا فضل حق خیرآبادی مورخہ ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۳۶ھ ہجری میں رقم طراز ہیں[۱]

"آپ نے جو اشعار ارسال فرمائے ہیں وہ ایسے ہیں اور ایسے ہیں۔ یہ تحفہ نہایت بیش قیمت ہے میں اس سے بہت متاثر ہوا.... میں مدت سے آپ کے کلام کا مشتاق تھا مگر کوئی ذریعہ میسّر نہ آیا تھا۔ بارے آپ نے خود سبقت فرمائی۔ میں اس کا ممنون ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلہ (مراسلت) کو جس کا آغاز فرمایا ہے منقطع نہیں ہونے دیں گے"

مولانا فضل حق نے مفتی خلیل الدین کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ مولانا خیرآبادی کے دو خط اور یہی ایک قصیدہ محفوظ رہ گیا ہے۔ مفتی خلیل الدین سے مراسلت کا آغاز بھی

۱۔ ملاحظہ ہو بیاض مولانا فضل حق خیرآبادی ص ۱۰۳۔۱۰۴

سنہ ۱۲۳۶ھ میں ہوا۔[1]

اودھ کی حکومت میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے ایک بھتیجے منشی کرم احمد[2] بھی ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ وہ نواب شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں وزیر امجد علی شاہ کے میر منشی تھے۔[3] منشی کرم احمد اس سے قبل رزیڈنسی دہلی کی طرف سے خدمات انجام دے چکے تھے اور سر اکٹر لونی کے منشی رہ چکے تھے۔[4] ممکن ہے کہ منشی کرم احمد ہی مولانا فضل حق کے لکھنؤ آنے کا سبب ہوئے ہوں۔

واجد علی شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد ۹ رجولائی سنہ ۱۸۴۷ء کو نواب امین الدولہ وزارت سے معزول ہوئے اور ان کی بجائے نواب نقی علی خاں (خسر واجد علی شاہ) وزیر مقرر ہوئے اور سفارت کے عہدے سے مصلح السلطان بھی معزول ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خوف سلطانی کی وجہ سے ریزیڈنٹ کے اکثر پیغام بادشاہ تک نہیں پہنچاتے تھے۔ اور ریزیڈنٹ اس بات سے پریشان تھا۔ ایک ضروری پیغام ریزیڈنٹ نے واجد علی شاہ کو بھیجا۔ مصلح السلطان نے حسب معمول وہ پیغام بادشاہ کے حضور میں عرض نہیں کیا۔ ۳ رذی قعدہ سنہ ۱۲۶۳ھ کو ریزیڈنٹ، کپتان برڈ کی ہمراہی میں بادشاہ کے پاس آیا اور اپنے پیغام کے جواب کا طالب ہوا۔ بادشاہ نے کہا کہ ہم تک آپ کا پیغام نہیں پہنچا۔ ریزیڈنٹ پہلے ہی سے نالاں تھا لہٰذا مصلح السلطان سفارت کے منصب سے معزول ہوئے اور طے پایا

---

[1] ملاحظہ ہو بیاض مولانا فضل حق خیر آبادی ص ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۹، ۱۸۹

[2] منشی کرم احمد بن فضل احمد بن احمد حسین برادر مولانا فضل امام خیر آبادی (باغی ہندوستان ص ۶۹ حاشیہ)

[3] باغی ہندوستان ص ۶۹ حاشیہ

[4] علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد دوم ص ۷۲، ۷۵

کہ کسی دوسرے شخص کو سفیر مقرر کیا جائے[۱] کمال الدین حیدر مولف قیصر التواریخ لکھتے ہیں۔[۲]

"خلاصہ باب سفارت میں مشورہ کن رکین سلطنت ہوا۔ نواب (علی نقی) نے بنظر حسن خدمت زمان سابق جو میر علی مرثیہ خواں کی سفارش سے حالت بیکاری میں نواب کو کچھ دیتے تھے۔ اس جہت سے اپنے محسن سابق افتخار الدولہ مہاراجہ میوہ رام بہادر کے تجویز کیا کہ میں ان کے بار احسان سے سبکدوش ہو جاؤں۔ وہ بھی بھڑور سے کئی مہینے سے لکھنؤ میں آئے تھے۔ نواب کے پاس آتے تھے لیکن جب صاحب ریذیڈنٹ سے استمزاج سفیر کا لیا۔ فرمایا وہ شخص ہو جو معاشرت صاحبان اور طریق رفتار و صدق کردار میں قابلیت رکھتا ہو۔ ورنہ ہماری موجب تکلیف کا ہوگا۔"

مندرجہ بالا معیار کے اعتبار سے مشیر الدولہ راجہ بال کرشن بہادر حسامت جنگ دیوان اور راجہ کندن لال بہادر میر منشی کی رائے سے مندرجہ ذیل چار حضرات کے نام تجویز ہوئے[۳]

۱۔ افتخار الدولہ مہاراجہ میوہ رام بہادر صلابت جنگ

۲۔ مفتی خلیل الدین سفیر زمانہ غازی الدین حیدر

۳۔ مولانا فضل حق خیرآبادی

۴۔ محمد خاں کلکٹر

آخر الذکر محمد خاں کی سفارش کپتان پالکس نے کی اور ۱۸ ذی القعدہ ۱۲۶۳ھ کو منصب

---

[۱] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۳۔۲۴، تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۳۶۔۱۳۷۔ [۲] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۴، نیز دیکھیے تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۳۶۔۱۳۷ [۳] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۴ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

سفارت پر فائز ہوئے[۱]۔ نواب شوکت الدولہ ان کا خطاب مقرر ہوا۔ وہ نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے[۲]۔ ڈھائی سال اس منصب پر فائز رہے۔ پھر مجتہد العصر کے فتوے کی بناء پر ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۶۶ھ کو عہدہ سفارت سے معزول ہوئے اور ان کی بجائے مسیح الدولہ حکیم مرزا علی حسن علیخان، بادشاہ کے معالج خاص اس عہدے پر فائز ہوئے[۳]۔

تاریخ اودھ میں سب سے پہلے سفارت کے عہدے پر تقرر کے ضمن میں مولانا فضل حق خیرآبادی کا نام آتا ہے گویا وہ واجد علی شاہ کی تخت نشینی ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ اور ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۶۳ھ کے درمیان لکھنؤ پہنچ چکے تھے اور ایسا امتیاز و اختصاص صفات رکھتے تھے کہ سفارت کے لیے ان کا نام تجویز ہوا۔

واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے لکھنؤ میں ورود فرمایا اور ۴ ذی الحجہ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۸۴۷ء کو واپس ہوا[۴]۔ اس نے انتظام سلطنت کی درستی اور اصلاح کے لیے بادشاہ سے خود کہا اور رزیڈنٹ کے ذریعے بھی فہمایش کی۔ بادشاہ نے قبول کیا۔ مولف قیصر التواریخ لکھتے ہیں[۵]:

"بعد روانگی نواب گورنر جنرل روز سہ شنبہ کو صاحب رزیڈنٹ شاہ عالم پناہ کے پاس آئے۔ وہ محبت نامہ جو حقیقت میں مثل حکم نامہ تھا، دیا اور پھر سب طرح سے کمال خلوص دولت خواہی سے فہمایش کر کے رخصت

(حاشیہ صفحہ سابقہ) د تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۳۷۔ ۱؎ ایضاً ص ۲۵ د ایضاً

۲؎ حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی (کراچی ۱۹۶۳ء) ص ۴۰۰

۳؎ تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۲۴۱ - ۲۴۲۔ ۴؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۴ د تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۴۶۔ ۵؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۵

ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا جو سب نے دیکھا۔ بادشاہ نے اقرار تعمیل فرمایا کہ انشاء اللہ بتدریج بموجب مکنونِ خاطر عمل میں لایا جائے گا۔ چنانچہ کچہری حضور تحصیل متعلقانِ انگریزی سے مقرر ہوئی۔ اس کے مہتمم مولانا فضل حق خیر آبادی ہوئے۔ اور بظاہر ممالک محروسہ امانی قرار پایا مگر اس میں شرط اجارہ کی تھی۔"

گویا نومبر ۱۸۴۷ء میں مولانا فضل حق، واجد علی شاہ کی حکومت میں حضور تحصیل کے مہتمم مقرر ہوئے۔ "متعلقانِ انگریزی" کی شرح کرتے ہوئے حکیم نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں۔ [1]

"ایک کچہری حضور تحصیل کے نام سے مقرر ہوئی اس کے مہتمم مولوی فضل حق خیر آبادی قرار پائے۔ مستغیثانِ سپاہ فوج سرکار کمپنی سکنہ ملک اودھ کی زمینداری کا مقدمہ محکمہ جات شاہی میں فیصل ہوا کرتا تھا مگر غفلت یا طمع عمال سے یا سرکشی تعلقہ دار سے وہ لوگ اپنے حق کو نہ پہنچ کر ہمیشہ داد بیداد کرتے رہتے تھے۔ ان کی دادرسی کے واسطے حضور تحصیل مقرر ہوئی۔"

گویا سرکار کمپنی کی فوج کے سپاہیوں کے حق کی حفاظت اور دادرسی کے لیے یہ محکمہ قائم ہوا جس کا نام حضور تحصیل اور اس کے مہتمم مولانا فضل حق خیر آبادی مقرر ہوئے۔ حالانکہ اس سے پہلے اس محکمہ "حضور تحصیل" کا دائرہ کار قدرے مختلف تھا۔ حکیم نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں: [2]

"اکثر علاقے ایسے بھی تھے کہ زمینداروں اور تعلقہ داروں نے اپنے آرام اور ادائے دقت کی وجہ سے ناظموں کے حکم سے تحصیل خزانہ

---

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۴۸، نیز دیکھئے قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۵

[2] تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۹۲۔

سرکارشاہی کرادیے۔ دیہات متفرق جو علاقوں سے نکال کر تحصیل خاص کے متعلق ہوئے۔ ان کے واسطے علیحدہ محکمہ مقرر ہوا جس کا نام حضور تحصیل تھا۔"

حکیم نجم الغنی خاں "حضور تحصیل" کے بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں [۱]

"اوّل سال جب یہ بادشاہ (واجد علی شاہ) تخت نشین ہوئے یہ منظور ہوا کہ تمام علاقہ جات قلمرو سلطانی حضور تحصیل ہو جائیں زمیندار اور تعلقہ دار اپنے وکلا کی معرفت زر آمدنی داخل خزانہ سلطانی کیا کریں، ناظم اور چکلہ دار موقوف ہو جائیں کہ یہ علاقہ پر جا کر زیادہ ستانی اور تنگ طلبی کرتے ہیں۔ رعیت تباہ اور نقصان سرکار بھی ہوتا ہے لیکن اہلکاروں نے کہ ان کے حاصلات لاکھوں روپے کے جاتے تھے۔ اس حکم کو جاری نہ ہونے دیا۔"

منشی امیر احمد مینائی لکھتے ہیں [۲]:

"لکھنؤ میں صدر الصدور تھے حالانکہ تمام کاموں پر مجتہد حاوی تھے۔"

حکیم نجم الغنی خاں لکھتے ہیں [۳]

"بادشاہ امجد علی نے عدالت کے نام کام سلطان العلماء [۴] و سید العلماء [۵]

---

[۱] تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۳۹۰ - [۲] انتخاب یادگار ص ۱۹۲

[۳] تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۲۶ - [۴] سلطان العلماء سید محمد بن مولوی دلدار علی (ف ۲۵ر جولائی ۱۸۶۷ء) ملاحظہ ہو تاریخ سلطان العلماء از مولوی آغا مہدی (کراچی ۱۹۶۷ء)۔

[۵] سید العلماء سید حسین بن مولوی دلدار علی (ف ۱۷ر صفر ۱۲۷۳ھ)

کو سونپ دیے تھے۔ انھیں کی تحقیقات اور تجویز سے مقدمات فیصل ہوتے تھے اور مصنّف الدولہ بہادر فرزند مجتہد کو دارو غگی عدالت عالیہ پر سرفراز فرمایا۔ اہل سنت کے عدالتی مقدمات کے تصفیے کے لیے مفتی بھی ان کی رائے سے مقرر ہوتے تھے۔"

صدر الصدور کے منصب پر خلاصۃ العلماء سید مرتضیٰ (ف ۱۸۶۰ء) فائز تھے۔ حکیم نجم الغنی لکھتے ہیں[1]

"محکمہ صدر تھانجات اس کو صدر الصدور بھی کہتے ہیں، اس میں تنقیح جرائم فوجداری ملک اودھ کی ہوتی تھی اور سید مرتضیٰ صاحب بن سید محمد صاحب مجتہد العصر بن سید دلدار علی صاحب کے زیر حکم تھا اور اس کے تحت ملک اودھ کے ہر ایک علاقے میں تھانجات اور برقنداز مقرر کیے گئے تھے۔"

محکمہ مرافعہ بھی مجتہد العصر مولوی سید محمد کے سپرد تھا۔ حکیم نجم الغنی کا بیان ہے[2]

"یہ محکمہ (مرافعہ) سلطان العلماء مجتہد العصر مولوی سید محمد صاحب کے ماتحت امجد علی شاہ کے عہد میں مقرر ہوا تھا۔ اور اس کے ذریعہ سے مفتیان شیعہ مذہب ملک اودھ کے جملہ مقامات میں فیصلے کے واسطے مقرر ہوتے تھے۔ جو مقدمہ ان سے فیصل نہیں ہو سکتا تھا، اس کا فیصلہ اسی محکمہ مرافعہ میں ہوتا تھا۔ اور خاص لکھنؤ میں محکمہ فوجداری علیحدہ تھا۔ اس کا فیصلہ بھی اسی محکمہ میں منظور و منسوخ ہوتا تھا۔"

---

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۸۹-۱۸۸۔ نیز دیکھیے تاریخ سلطان العلماء ص ۴۵-۴۶۔

[2] تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۱۸۷-۱۸۸

ان مجتہدین کی موجودگی میں مولانا فضل حق خیرآبادی کا صدر الصدور کے منصب پر فائز ہونا نہایت اہم تھا۔ وزیر سلطنت علی نقی خاں سے ان کے اچھے تعلقات اور روابط تھے۔ علی نقی خاں سیاہ و سپید کے مالک تھے اور انگریزوں کے وفادار بلکہ رزیڈنٹ کے معتمد۔ مولانا فضل حق خیرآبادی عربی قصیدہ نگاری میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے وزیر سلطنت علی نقی خاں کی مدح میں ایک زوردار قصیدہ لکھا ہے۔ یہ قصیدہ طبع ہوچکا ہے اور بعض کتب خانوں میں اس قصیدے کے خطی نسخے بھی محفوظ ہیں۔ مولوی نجم الحسن خیرآبادی لکھتے ہیں[1]

> "اودھ کے تاجدار اور وزراء کے دربار میں بھی علامہ (فضل حق) کو رسوخ حاصل تھا۔ نواب علی نقی خاں کے ساتھ آپ کے روابط رہے ہیں۔ آپ نے ان کی شان میں ایک نظم اور نثر عربی زبان میں لکھی ہے۔ جو کسی زمانے میں طبع بھی ہوئی تھی مگر اب نایاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر حکیم انتظار حسین خیرآبادی کے پاس محفوظ ہے۔"

ہنومان گڑھی کا واقعہ واجد علی شاہ کے عہد کا ایک حادثہ فاجعہ ہے۔ اجودھیا میں بابر کے عہد کی ایک مسجد اور چند دوسری مساجد بھی تھیں۔ ساتھ ہنومان گڑھی کے نام سے ہندوؤں کا ایک استھان اور مندر تھا۔ مسلمانوں کی قلت تعداد کی وجہ سے ہندو ہمیشہ ان مساجد کی بے حرمتی کرتے تھے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں ہندو تعلقہ داروں کی شہ پر گڑھی کے مہنت اور بھی خودسر ہوگئے تھے۔ انھوں نے مسجد کے ایک حصے کو نقصان پہنچایا۔ اذان دینے کی ممانعت کردی اور مسجد کی بے حرمتی کی، جولائی ۱۸۵۵ء میں شاہ غلام حسین

---

[1] خیرآباد کی ایک جھلک از مفتی نجم الحسن خیرآبادی (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۰ء)

اور مولوی محمد صالح، اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر ایک جماعت لے کر ہنومان گڑھی پہنچے۔ بیراگیوں نے انھیں گھیر لیا۔ حکومت کے بعض افسر بھی رشوت لے کر ان سے مل گئے۔ بیراگیوں سے مل گئے۔ بیراگیوں سے مقابلہ ہوا۔ ۲۶۹ مسلمان مسجد میں ذبح کر دیے گئے۔ قرآن کریم کو پیروں سے روندا گیا۔ جوتے پہن کر مسجد میں سنکھ بجایا گیا۔ یہ سب کچھ واجد علی شاہ کی حکومت اور علی نقی خاں کی وزارت میں ہوا۔[1]

اس خونی حادثے اور ناموس اسلام کی ہتک پر مولوی شاہ امیر علی جہاد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی تقریروں نے مسلمانوں میں آگ لگا دی اور ہیجان برپا کر دیا۔ رام پور، بریلی، پیلی بھیت، اضلاع روہیل کھنڈ سے مجاہدین پہنچنے لگے۔ واجد علی شاہ کی حکومت پریشان ہو گئی۔ وزیر علی نقی کی بُری حالت ہوئی۔ امراء و عمائد سمجھانے بجھانے کے لیے دوڑے۔ حکومت کے عمال ہندو تعلقہ داروں سے مل گئے تھے۔ مجتہدین اور علماء نے حکومت کی مدد کی۔ مفتی سعد اللہ مرادآبادی (ف ۱۲۹۴ھ ــــــ) مولوی ابوالحسن فرنگی محلی (ف ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء) مولوی حسین احمد ملیح آبادی (ف ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۹ء) مولوی محمد یوسف فرنگی محلی (ف ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء) مولوی برہان الحق فرنگی محلی (ف ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء) مولوی خادم احمد فرنگی محلی (ف ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء) مولوی تراب علی (ف ۱۲۸۱ھ) اور مولانا فضل حق خیرآبادی وہ نامور علماء ہیں[2] جنھوں نے حکومت اودھ کے نقطۂ نظر کی تائید و توثیق کی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مولوی امیر علی کی تحریک کو نقصان پہنچا۔ مولوی فضل حق اور مفتی سعد اللہ تو خیر حکومت اودھ کے ذمے دار ملازم تھے اور وزیر علی نقی خاں سے تعلق

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۱۲

[2] ان علماء کے حالات تذکرہ علمائے ہند میں مذکور ہیں۔ حروف تہجی کے اعتبار سے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں نیز دیکھیے تذکرہ علمائے فرنگی محل (مولوی عنایت اللہ فرنگی محلی) و احوال (حاشیہ صفحہ ہذا آئندہ صفحہ پر)

رکھنے والے تھے، لہٰذا مجبور تھے۔

مولوی امیر علی سے یہ بھی غلطی ہوئی کہ انھوں نے حکومت کے ملازم علماء اور عمائد پر نہ صرف اعتماد کیا بلکہ وفود اور ثالثی میں بھی شریک کیا۔ جس سے ان کے مقصد کو نقصان پہنچا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت اودھ کے اشارے پر یہ لوگ شریک کیے گئے ہوں۔ چنانچہ ایک ثالثی کا حشر ملاحظہ ہو۔ حکیم نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں[1]:

"۲۲ محرم ۱۲۷۲ھ کو وکلائے لشکر اسلام و افسران فوج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ نواب احمد علی خاں، مولوی غلام جیلانی، مولوی غلام احمد شہید اور مولوی فضل حق خیر آبادی چار ثالث مقرر ہوئے۔ لیکن یہ عجیب ہے کہ ایک دن بھی وکلائے اسلام اور مہنت کی روبکاری رو برو نہ ہوئی۔"

۲۷ محرم ۱۲۷۲ھ کو مولوی امیر علی نے جو منظوم عرضداشت واجد علی شاہ کے حضور میں بھیجی وہ بھی مولوی برہان الحق، مولوی عبد الرزاق فرنگی محلی اور نواب علی کے ذریعے ارسال کی۔ اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا[2]۔ حکیم نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں[3]:

"ارکان دولت نے اپنے طمع نفسانی سے مولوی صاحب کی عرضداشت منظوم بادشاہ کے ملاحظہ میں نہ گزرانی۔ آخر کار کوتاہ اندیشیوں نے دنیا کے طمع سے کام کیا۔"

(حاشیہ صفحہ سابقہ) علمائے فرنگی محل (شیخ الطاف الرحمٰن قدوائی)۔

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۲۱۷

[2] حدیقۃ الشہداء از مرزا جان (مطبع احمدی مدراس ۱۳۰۰ھ) ص ۳۴-۳۶

[3] تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۲۱۷

مجتہدین لکھنؤ، علمائے فرنگی محل اور دوسرے علماء نے بھی اس طرح فتوے دیے جس سے حکومتِ اودھ کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی تھی۔ ان میں بعض تو حکومت اودھ کے براہِ راست ملازم تھے۔ قیصر التواریخ کا ہم عصر مؤلف لکھتا ہے[۵۷]:

"اس عرصہ میں حسب الحکم بادشاہ اور فہمائش حضورِ عالم (علی نقی خاں وزیر) سے سلطان العلماء (سید محمد) نے بھی اس باب میں کچھ تحریر کیا (خبر) مولوی (امیر علی) صاحب کو پہنچی لیکن اوسے خلاف نفس الامر سمجھے، پھر سلطان العلماء نے کوئی فتویٰ بر تصریح حکم سرکار سے دستخط نہ کیا بلکہ جواب دیا کہ ایک شخص نے غرض نفسانی رفع توہین اسلام پر کمر باندھی ہے اور تن بمرگ دیا ہے۔ سراسر اوس کے حق بجانب ہے کیونکر خلاف شریعت غرائے احمدی بخوف حاکم لکھوں، لیکن مقام حیرت یہ ہے کہ تمام ہندوستان میں لکھنؤ دارالمومنین مشہور ہے۔ ایک مسکین ضعیف و نحیف نے ہمت مردانگی کی ہے۔ مقام عبرت ہے علمائے فرنگی محل نے بھی اسی طریق سے تحریر کیا بلکہ راضی ہوئے اس امر پر حاکم وقت کو اپنے شہر میں رہنے دینے کا اختیار ہے۔ کبھی ہم فتویٰ قتل اس شخص کا نہ دیں گے مولوی محمد اصغر کے نواسے نے بھی فتویٰ دستخط کیا۔ علماء ظاہر اہلِ سنت مثل مولوی محمد حسین احمد، غلام جیلانی وکیل عدالت انگریزی، مولوی محمد یوسف، مولوی فضل حق خیر آبادی، مولوی محمد سعد اللہ جو حج خانۂ کعبہ سے مشرف ہو کر آئے تھے اور بعض علماء گمنام نے بھی محض بطمع دنیا بخوف حاکم حکم فتویٰ قتل

---

[۵۷] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۲۵

عبارات مختلف سے رنگین کر کے دیا اور بعض علمائے شاہجہان آباد
نے بھی ایسی حجت و برہان سے لکھا۔ یعنی جب اہلِ اسلام قلیل ہوں
اور غلبۂ کفار ہو اس وقت خلاف حکم اولی الامر یعنی حاکم وقت صاحبانِ
عالیشان یا اہل اسلام جو ان کے اختیار میں ہوں جہاد حرام ہے
اور جو شخص مرتکب ایسے امر کا ہو وہ طاغی و باغی ہے۔"

حکیم نجم الغنی خاں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک قلمی مجموعہ "علماء کے فتاوے" دیکھے ہیں جو کتب خانہ رام پور میں موجود ہیں۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں[1]:

"میں نے اس کے متعلق جو قلمی کاغذات کا مجموعہ دیکھا ہے اس میں
مہنتوں کے بیانات، موضوع متنازعہ کا نقشہ، علی نقی خاں وزیر کے
خطوط مجتہد کے نام، مجتہد کے خطوط مولوی امیر علی کے نام اور مولوی
صاحب کے جوابات، دوسرے اہلکاران متعلقہ کی تحریریں، علماء کے
فتوے سب کچھ موجود ہیں۔ ان میں مجتہد صاحب کی کوئی تحریر مولوی
امیر علی کے موافق موجود نہیں، بلکہ ان کے خلاف ہے۔"

ان حالات میں مولوی امیر علی کئی ہزار کی جمعیت کے ہمراہ مہنتوں کی سرکوبی کے لیے نکل کھڑے ہوئے، سخت معرکہ ہوا، ۶۰۰ سے زیادہ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ مولوی امیر علی شہید ہوئے، واجد علی شاہ کی حکومت، علی نقی خاں کی وزارت، مجتہدین لکھنؤ، علمائے فرنگی محل اور مفتی سعد اللہ اور ان کے رفقاء کے فتوے اور خالص اسلامی مسئلہ پر مسلمانوں کا قتلِ عام۔

ع: آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

---

[1] تاریخ اودھ جلد پنجم۔

۴ر فروری ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ کی معزولی کا حکم نامہ پہنچا۔ بادشاہ نے دستخط نہیں کیے، خارج البلد ہوا۔ نہ بادشاہی رہی نہ وزارت نہ عملہ نہ فعلہ، "لکھنؤ شد خراب واویلا" اس کی تاریخ ہوئی۔[۱]
۱۲۷۲ھ

ہنومان گڑھی اور مولوی امیر علی کے سلسلے میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا جو کردار رہا ہے اس کے متعلق باندازِ ایجاز مولوی عبد الشاہد خاں شروانی نے اس طرح تبصرہ کیا ہے[۲]

"شاہ صاحب (مولوی امیر علی) کے سمجھانے کے لیے علماء و امراء کو بھیجا، علامہ (فضل حق خیر آبادی) نے بھی عہدے کی ذمہ داری اور بسہولت مطلب برآری کی بناء پر گفتگو میں حصہ لیا۔"

انتزاع لکھنؤ کے بعد ہی مولانا فضل حق لکھنؤ چھوڑ کر الور چلے گئے۔ مولانا کم و بیش ۹ر سال واجد علی شاہ کی حکومت میں کارگزار رہے۔ عہدِ واجدی پر انھوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے[۳]

قد کان النصاریٰ اخذ وذلک   نصاریٰ نے اس والی (واجد علی شاہ) سے

---

[۱] بہادر ہنومان گڑھی (اجودھیا) ۱۸۵۵ء پر خاکسار نے تفصیل سے لکھا ہے ملاحظہ ہو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء از محمد ایوب قادری (پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء) ص ۹۲-۱۱۶۔ [۲] باغی ہندوستان ص ۱۳۵۔

[۳] باغی ہندوستان ص ۲۷۴، الیواقیت المہریہ از مولانا غلام علی مہر (مکتبہ مہریہ چشتیان ۱۹۶۴ء) ص ۵۹۔ مفتی سعد اللہ کے کردار پر سر سید احمد خاں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے: "مفتی سعد اللہ صاحب نے لکھنؤ میں ایک نیک بخت مسلمان آلِ رسول ابن علی اولادِ نبی مولوی امیر علی کے کفر و قتل کا فتویٰ دے کر عشرۂ محرم میں ان کا سر ہنومان گڑھی سے نیزے پر چڑھا کر لکھنؤ میں لانا چاہا تو ہمارا دل ٹھنڈا ہو گیا اور سمجھے کہ آلِ رسول کے قتل و کفر پر فتویٰ دینا ان کا قدیمی پیشہ ہے۔" (حیاتِ جاوید، ص ۶۳۱۔ طبع لاہور ۱۹۵۷ء)۔

الملك من واليه وكان واهيًا بالملاهي	اس کا ملک چھین لیا۔ وہ بڑا داہی ولاہی تھا
لاهيًا عن الملك لاهيًا ولم يك	عیش طرب میں منہمک، انتظام ملکی سے غافل،
حازمًا ولا هيا بنقض العهود	عقل وخرد سے بیگانہ اور نقض وعہد و
والمواثق۔	میثاق میں یگانہ تھا۔

افسوس کہ مولانا خیرآبادی کے لکھنؤ کے قیام کے زمانے کی تدریسی سرگرمیوں کا تفصیلی حال کہیں نظر سے نہیں گزرا مگر یہ یقین ہے کہ مفوضہ سرکاری ذمے داریوں کے باوجود ان کا درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا اور مندرجہ ذیل حضرات نے لکھنؤ میں مولانا خیرآبادی سے تعلیم حاصل کی۔

۱۔ مولانا نور احمد بدایونی[۱] ۲۔ مولانا عبدالقادر بدایونی[۲]

۳۔ مولوی محمد محسن ترہتی صاحب الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی[۳]

۴۔ مولوی عبداللہ بلگرامی (ف ۱۳۰۵ھ)[۴]

۵۔ مولانا شاہ عبدالحق کانپوری (ف ۱۳۱۲ھ)[۵]

ان میں سے اوّل الذکر ہر سہ حضرات مولانا خیرآبادی کے ہمراہ الور گئے اور وہاں کے قیام میں ان علماء کی طالب علمی کا ذکر ملتا ہے جیسا کہ ہم نے الور کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

---

[۱] [۲]۔ بیاض مولانا عبدالقادر بدایونی (خطی) مخزونہ کتب خانہ مدرسہ قادریہ بدایوں)

[۳] آئینہ نزہت از بابو بہاری لال (مطبع بہار کشمیر لکھنؤ) ص ۱۱۲

[۴] تذکرہ علمائے اہل سنت از مولوی محمود احمد قادری (خانقاہ قادریہ اشرفیہ، اسلام آباد بھوانی پور ۱۳۹۱ھ) ص ۱۱۵ - ۱۱۶

[۵] ایضاً ص ۱۷۹ - ۱۸۰

الور

جب ۱۸۱۵ء میں الور کا راجا بختاور سنگھ فوت ہوا تو راج کے دو دعویدار ہوئے (۱) بنے سنگھ۔ جو راجہ بختاور سنگھ کی موسیٰ نامی طوائف کے بطن سے تھا۔ (۲) بلونت سنگھ۔ جو راجہ کا بھتیجا تھا۔

۱۸۲۵ء میں بلونت سنگھ لاولد فوت ہو گیا اور اب راجا بنے سنگھ ریاست کا بلا شرکت غیرے حکمراں رہا اور مہاراؤ راجا اس کا خطاب قرار پایا۔ ریاست میں نہایت بدانتظامی تھی۔ آغا خوشنویس کے مشورے سے ۱۸۳۸ء میں رزیڈنسی دہلی کے میر منشی امو جان (امین الدین) کو بلا کر ریاست الور کا دیوان مقرر کیا اور سات سو روپیہ ماہوار ان کی تنخواہ مقرر ہوئی۔

نواب فیروزپور جھرکہ کے ملازم، مرزا اسفندیار بیگ کو نائب دیوان کا عہدہ دیا۔ ان کا مشاہرہ تین سو روپیہ ہوا۔ ان اہلکاروں کی بدولت ریاست کی حالت قدرے سنبھل گئی اور قرض بیباق ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد امو جان نے ہاتھ پیر نکالے۔ مرزا اسفندیار بیگ نے فہمایش کی اور نشیب و فراز سے آگاہ کیا مگر امو جان نہ مانے اور انھوں نے مرزا اسفندیار بیگ ہی کو معطل کر دیا۔ مرزا اسفندیار بیگ بھی گھات میں رہے اور جب ان کا داؤ لگا تو انھوں نے بھی پورا پورا بدلہ لے لیا۔ ریاستوں میں تو سیاست کا یہی انداز ہوتا ہے۔ ۱۸۵۶ء میں امو جان اور اس کے بھائی فضل اللہ اور انعام اللہ پھر ریاست کے کارگزار بن گئے[1] اور یہی وہ زمانہ ہے کہ جب مولانا فضل حق

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) وقائع راجپوتانہ ... (حاشیہ صفحہ ہذا آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

خیر آبادی الور پہنچے کیونکہ فروری ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کو کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر لیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ منشی امو جان ہی مولانا خیر آبادی کے الور آنے کا سبب ہوں کیونکہ وہ رزیڈنسی کے میر منشی رہے تھے اور دہلی کے قدیم باشندے تھے لہٰذا مولانا خیر آبادی سے ان کے تعلقات ہونا یقینی ہیں۔ مولانا فضل حق کے شاگرد مولوی نور الحسن کاندھلوی بھی الور میں رہ چکے تھے ممکن ہے انھوں نے کوئی سبیل پیدا کی ہو[۱]

الور کا راجا علم و فن کا قدر دان تھا حکیم نجم الغنی خاں لکھتے ہیں[۲]

"راؤ راجا (بنے سنگھ) نے آغا جو ش نویس سے پچاس ہزار روپیہ کے مصارف میں کتاب گلستاں لکھوائی۔ مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی نامور منطقی کو اپنے یہاں نوکر رکھا۔"

منشی جوالا سہائے قدرے تفصیل سے لکھتے ہیں[۳]

"راؤ راجا (بنے سنگھ) اگرچہ خود چنداں تربیت یافتہ نہ تھے مگر علوم و فنون کے بہت قدر دان تھے کتب خانے میں سنسکرت و فارسی و ہندی کی عمدہ نایاب کتابیں جمع کیں۔ ازاں جملہ ایک گلستان سعدی آغا صاحب

(حاشیہ صفحہ سابقہ) (منشی جوالا سہائے آگرہ ۱۸۷۲ء

(۲) کارنامہ راجپوتاں از حکیم نجم الغنی خاں (پنجابی گزٹ پریس بریلی) ص ۳۴۹۔ ۳۵۴۔

(۳) تاریخ راجگان ہند از حکیم نجم الغنی خاں (ہمدم برقی پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ء) ص ۳۶۴۔ ۳۷۲۔

(۴) کارنامہ سروری (خود نوشت حالات سرور الملک) مرتبہ نواب ذوالقدر جنگ (علی گڑھ ۱۹۳۳ء) ص ۱۴۔ ۱۵۔

[۱] حالات مشائخ کاندھلہ ص ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ [۲] کارنامہ راجپوتاں ص ۳۵۴ نیز دیکھیے تاریخ راجگان ہند۔ [۳] وقائع راجپوتانہ ص ۳۷۲

خوش نویس کی لکھی ہوئی پچاس ہزار روپیہ کی لاگت کی ہے اور قاضی عصمت اللہ کا دستخطی قرآن شریف بہت بے بہا ہے اور مردان اہل کمال اس مرتبہ کے بہم پہنچائے کہ کسی ریاست میں نہ تھے۔ چنانچہ پنڈت روپ نرائن دھرم شاستری و بید و پنڈت موتی رام و پرتھی دھر منتر شاستری و ادھیا نیلا سپر و پنڈت لچھمی دت اسی اپنے علم میں یکتائے روزگار تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی آفتاب ہند، ممن و میاں جان چابک سوار، تان رس خاں کلاونت، امرت سین و عنایت حسین، رحیم سین، ستار نواز، سکھ دیو و صدیق پہلوان، جیوا کاریگر، سیتا رام مستری، میر باقر علی پٹہ باز، میاں میر و آغا خوشنویس، شیخ ابراہیم شمشیر باز، عبد اللہ کتھک، کہ ہر ایک اپنے اپنے ہنر و فن میں وحید عصر و منتخب روزگار تھے۔ سرکار میں ملازم تھے۔"

الور میں مولانا فضل حق کا ساڑھے چار سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ مبارک شاہ جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں دہلی میں کوتوال تھا اس کا بیان ہے[۱]

Maulvi Fazl Huq of Khairabad who Was in the Alwar raja's service on a monthly salary of Rs. 450/= now arrived in Delhi.

"خیر آباد کے مولوی فضل حق جو الور کے راجا کی ملازمت میں چار سو پچاس (۴۵۰)

---

۱ Michael Edwardes, *Red Year ; the Indian Rebellion of 1857* (London : Cardinal, 1975), 212.

روپیہ ماہوار کی تنخواہ پر تھے، اب دہلی میں آ گئے۔

مولانا خیر آبادی کے ہمراہ مستعد طلبہ بھی تھے جن میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے نام بالصراحت ملتے ہیں:

۱۔ مولانا نور احمد بدایونی[۱]　　۲۔ مولانا عبد القادر بدایونی[۲]

۳۔ مولوی محمد محسن مؤلف الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی[۳]

ان طلبہ کو مولانا فضل حق روزانہ سولہ سولہ سبق پڑھاتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں:[۴]

"مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک خط میرے پاس محفوظ ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں کہ آج کل درس قوت سے جاری ہے۔ سولہ سبق روزانہ پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ قیام الور کا واقعہ تھا۔"

محولہ بالا خط طبع بھی ہو گیا ہے[۵] اس کا ضروری اقتباس ملاحظہ ہو:[۶]

---

[۱] مولوی نور احمد بن مولوی محمد شفیع عثمانی بدایونی ۱۲۳۰ھ یا ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا فیض احمد بدایونی اور مولانا فضل حق سے تحصیل علوم کی۔ تمام عمر درس و تدریس میں گزری۔ ان کے تلامذہ میں نامور علماء تھے۔ ۱۳۰۱ھ میں انتقال ہوا۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ الواصلین از رضی الدین بدایونی (بدایوں ۱۹۴۵ء) ص ۲۵۸، اکمل التاریخ جلد اول (بدایوں ۱۹۱۲ء) تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۵۳۲۔

[۲] مولانا عبد القادر بن مولانا فضل رسول بدایونی ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں انتقال ہوا (تذکرہ علمائے ہند ص ۳۱۱) طوالع الانوار، (مولوی انوار الحق بدایونی سیتاپور ۱۲۸۹ھ) ص ۱۸۔ مولانا عبد القادر، مولانا نور احمد اور مولانا محمد محسن بن یحییٰ ترہتی مؤلف الیانع الجنی، لکھنؤ سے مولانا کے ہمراہ (بقیہ حاشیات آئندہ صفحہ پر)

امروز روز پانزدہم است کہ برخوردار نور الابصار
مولوی عبدالحق سلمہ اللہ تعالیٰ نزد من رسیدہ اند چوں
مہاراو راجا بہادر الور چندے دنی بخش راج گڑھ
دوازدہ کروہ ہے الور اند و ہنوز معاودت نکردہ اند،
ملازمت برخوردار صورت نہ بستہ است۔ دریں
جا شغل تدریس بیشتر است، شانزدہ سبق می شود
مولوی نور احمد صاحب افق المبین مع حاشیہ و
اعزاز جان مولوی عبدالقادر شرح اشارات،
محاکمات و شرح قاضی مع حاشیہ می خوانند، فہم
درست دارند۔ برخوردار مولوی عبدالحق نیز
سہ چار سبق می داشتند، دیگر جز تمنا چہ نویسم۔
لازمہ محبت آن ست کہ در ہر ماہ خطے متضمن حال
خیر استحال خود حوالہ ڈاک بیرنگ کردہ باشند۔
خطے کہ بہ ڈاک بیرنگ می باید۔ بیشتر می رسد
و بہمین جہت بندہ التزام کردہ است کہ بہمہ

آج پندرھواں دن ہے کہ برخوردار نور الابصار
مولوی عبدالحق سلمہ اللہ تعالیٰ میرے پاس پہنچے
ہیں چونکہ مہاراؤ راجہ بہادر راج گڑھ میں ہیں جو
الور سے بارہ کوس ہے اور ابھی تک واپس نہیں
آئے ہیں، برخوردار (مولوی عبدالحق) کی ابھی تک
ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ یہاں تدریس کا شغل
خوب ہے۔ سولہ سبق ہو جاتے ہیں۔ مولوی
نور احمد صاحب افق المبین مع حاشیہ اور عزیز
خاص مولوی عبدالقادر شرح اشارات و
محاکمات و شرح قاضی مع حاشیہ پڑھتے ہیں
اور سمجھنے کی قوت خوب رکھتے ہیں۔ برخوردار
مولوی عبدالحق کے پاس بھی تین چار سبق ہیں۔
اس کے علاوہ بجز تمنائے (ملاقات) کے کیا
لکھوں۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مہینے اپنی
خیریت کا حال لکھ کر بیرنگ ڈاک کے ذریعے

(حواشی صفحہ سابقہ) الور آئے تھے۔ ۳؎ الیانع الجنی ص ۹۳

۴؎۔ استاذ العلماء (حالات مفتی لطف اللہ علی گڑھی) مولانا حبیب الرحمن شروانی (مکتبہ قادریہ لاہور ۱۹۸۰ء) ص ۳۸۔

۵؎۔ یہ خط مفتی سلطان حسن بریلوی کے نام ہے۔

۶؎ باغی ہندوستان ص ۲۴۷-۲۴۸

کساں خطوط بیرنگ می فرستم، والسلام بھیجا کرد جو خط بیرنگ ڈاک سے آتا ہے وہ اکثر پہنچتا ہے۔ اس لیے میں نے یہ التزام کیا ہے کہ ہر کسی کو بیرنگ خط بھیجتا ہوں۔

راقم محمد فضل حق ختم اللہ لہٗ بالحسنیٰ

پنجم ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ، روز پنجشنبہ

الور کے قیام کے دوران ہی مولوی فضل حق خیرآبادی نے اپنے دوست مرزا غالب کے لیے نواب یوسف علی خاں رئیس رام پور کے ہاں کوشش کی اور نواب کو خط لکھا اور ساتھ ہی مرزا غالب کو بھی مطلع کیا۔ مولانا فضل حق کا یہ خط مرزا غالب کو ۲۷/ جنوری (۱۸۵۷ء) کو موصول ہوا۔ ۲۸/ جنوری (۱۸۵۷ء) کو مرزا نے نواب یوسف علی خاں کو عریضہ لکھا۔ اس کے جواب میں نواب نے ۲۵/ فروری کو کچھ اشعار اصلاح کے لیے مرزا غالب کو بھیجے اور ان کو خط بھی لکھا جس میں مولانا فضل حق کا حوالہ دیا ہے[1]

"خط مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد فضل حق صاحب با دیگر مراتب محبت و اشفاق بعبارت رنگین در تین در عین انتظار سرمہ کش عیون وصول نشاط شمول گردیدہ۔"

چنانچہ مرزا غالب نے نواب یوسف علی خاں کے حضور میں مدحیہ قصیدہ ارسال کیا اور مرزا نے اس کی ایک نقل مولانا فضل حق کو اور بھیجی۔ مولانا خیرآبادی نے ۱۰/ اپریل ۱۸۵۷ء کو اس بارے میں نواب یوسف علی خاں کو اس طرح لکھا[2]

"بعز عرض می رساند کہ خیر سگال با فضال ایزد بے ہمال بصحت و

---

[1] مکاتیب غالب (متن) ص ۵

[2] مکاتیب غالب (دیباچہ عرشی) ص ۶۔

اعتدال بالور رسیدہ، ملاحظہ مرزا صاحب مشفق نجم الدولہ مرزا
اسداللہ خان متخلص بہ غالب مع قصیدہ میمیہ کہ در مدح حضور فیض معمور
منظوم کردہ انداز ڈاک خانہ یافت . . . مرزا صاحب حق سپاس
گزاری ادا کردہ اند، نظم قصیدہ مدحیہ در غایت بلاغت
انجام است غالباً شرف اندوز ملاحظہ والا شدہ باشد"

مولانا فضل حق خیر آبادی الور میں تھے کہ مئی ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا آغاز ہوا۔ راجا بنے سنگھ نے انگریزی حکومت کی مدد کی[۱] جنگ کا آغاز ہوتے ہی راجا بنے سنگھ نے دیوان امو جان کو پرگنہ فیروز پور ضلع گوڑ گانوہ کے بندوبست و انتظام کے واسطے بھیجا مگر امو جان کی طمع، میوات کی سرکشی اور راجا کی بیماری کی وجہ سے اس علاقے کا بندوبست نہ ہو سکا مگر گوڑ گانوہ میں قلعہ تعمیر کرا کے اپنے علاقے کا بندوبست کر لیا۔[۲]

راجا نے بارہ سو آدمیوں کی جمعیت اور چار ضرب توپ چمن سنگھ کی ماتحتی میں قلعہ آگرہ میں محصور انگریزی فوج کی مدد کے لیے بھی بھیجی۔ اتفاق سے راجا کے آدمیوں کو شکست فاش ہوئی اور دس نامی راجپوت سردار مارے گئے اور بعد کو ان کے وارثوں کو انگریزی سرکار سے خلعت ملے[۳]

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ریاست الور کا یہ کردار رہا۔ ۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو مہاراؤ راجا بنے سنگھ نے ملک عدم کی راہ لی[۴] راجا بنے سنگھ کے مرنے کے بعد الور میں مولانا

---

[۱] مختصر سیر گلشن ہند از بابو رام (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۸ء) ص ۲۶۱

[۲] وقائع راجپوتانہ از جوالا سہائے ص ۳۷۳-۳۷۴ و تاریخ راجگان ہند ص ۳۷۲۔

[۳] کارنامہ راجپوتاں ص ۳۵۴ و وقائع راجپوتانہ ص ۳۷۳

[۴] مرقع الور از محمد مخدوم تھانوی ص ۱۵۵ بحوالہ "تحریک" دہلی، جون ۱۹۶۰ء ص ۱۲

فضل حق کا قیام ایک ماہ تک رہا۔ ایک ماہ بعد (۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کے بعد) مولانا اپنے بیوی بچوں کو لینے کے لیے دہلی پہنچے اور ان کو لے کر الور چلے آئے۔ جیسا کہ مولانا نے اپنے مقدمے میں بیان دیا ہے[۱]

"میں راجا الور کے ہاں ملازم تھا اور بغاوت شروع ہونے کے زمانہ میں اسی کے پاس تھا۔ راجہ بنے سنگھ کی وفات کے بعد ایک مہینے تک میں الور میں رہا۔ میں اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے روانہ ہوا اور دہلی آیا۔ وہاں میں پندرہ دن رہا۔ اور پھر الور واپس چلا گیا۔ میں نے اپنے اہل و عیال کو یہاں الور میں چھوڑا اور دسمبر ۱۸۵۷ء میں خیر آباد کی راہ لی۔"

یہ ایک ہلکا سا مرقع ہے مولانا فضل حق خیر آبادی کے دورِ ملازمت کا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی نے اپنی ساٹھ سالہ زندگی نہایت عیش و عشرت، تنعم اور فارغ البالی میں گزاری جیسا کہ خود انھوں نے اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں تبصرہ کیا ہے[۲]

کانت لفضل الحق فضل مثالہ	منھا علی الامثال لی استعلا
فضل حق کے لیے رفعت و بلندی کا فضل تھا	اسی وجہ سے مجھے برابر والوں پر سربلندی تھی
دوجاھۃ بین الوجوہ وجاھۃ	تعنولھا الاعیان والرؤسا
شرفا میں قدر و منزلت و وجاہت میسر تھی	جن کے سامنے رؤسا اور اعیان ملک جھکتے تھے
وبراعۃ ورفاعۃ ودقاھۃ	ونزاھۃ ونباھہ وعلا
کمال، رفعت، وسعت	نزہت، بزرگی، برتری
وجد وجد مسعد معجدۃ	لم نبلھا بلوی ولا لاواء

تونگری قلب، خوش بختی، نصیبہ وری، یہ سب نعمتیں حاصل تھیں جنھیں آزمائش و مصیبت بھی بوسیدہ نہ کر سکی۔

---

[۱] ماہنامہ "تحریک" دہلی جون ۱۹۶۰ء ص ۱۲۔
[۲] باغی ہندوستان ص ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۶۔

وتمام عافية وعرض زاده | عرض يزيد وعزة لتا
پوری عافیت بڑھتے ہوئے سامان کی بنا پر | بڑھتی ہوئی آبرو اور پائیدار عزت بھی نصیب تھی
عافيتني ستين عاماً لا تني | تزد ادلی من فضلك الآلاء
ساٹھ سال تک تو نے مجھے امن و عافیت میں رکھا | تیرے فضل سے اس مدت میں نعمتیں بڑھتی ہی رہیں

کتابیات

۱۔ آب حیات، مولوی محمد حسین آزاد، لاہور ۱۹۵۷ء

۲۔ آثار الصنادید، سر سید احمد خاں، سنٹرل بک ڈپو دہلی ۱۹۶۵ء

۳۔ احوال علمائے فرنگی محل، الطاف الرحمٰن قدوائی، مطبع مجتبائی لکھنؤ

۴۔ اخبار الصنادید، حکیم نجم الغنی خاں، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۸ء

۵۔ ارمغان ہندوستان، محبوب حسن (ادارہ برہانیہ حیدر آباد دکن ۱۳۱۱ھ)

۶۔ ارواح ثلاثہ (مجموعہ امیر الروایات، روایات الطیب، اشرف التنبیہ) امیر شاہ خاں وغیرہ (سہارن پور ۱۳۷۰ھ)

۷۔ استاذ العلماء (حالات مفتی لطف اللہ علی گڑھی) مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (مکتبہ قادریہ لاہور ۱۹۸۰ء)

۸۔ اکمل التاریخ، مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری (بدایوں ۱۹۱۶ء)

۹۔ الهدية السعيدية، مولانا فضل حق خیر آبادی (مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۳ھ)

۱۰۔ " " " (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۸ھ)

۱۱۔ اليانع الجني في اسانيد الشيخ عبد الغني، محمد محسن ترہتی (بشمول دیگر رسائل (دار الاشاعت دیوبند ۱۳۴۹ھ)

۱۲۔ الیواقیت المہریہ (شرح الثورۃ الہندیہ) مولانا غلام مہر علی (مکتبہ فہر چشتیاں ۱۹۶۴ء)
۱۳۔ امیر نامہ (اردو) سعید احمد اسعد (مطبع محمدی ٹونک ۱۲۹۴ھ)
۱۴۔ آئینۂ نزہت، بابو بہاری لال فطرت (مطبع بہار کشمیر لکھنؤ)
۱۵۔ باغی ہندوستان مرتبہ مولوی عبد الشاہد خاں شروانی (مکتبہ قادریہ لاہور ۱۹۷۴ء)
۱۶۔ بیاض مولانا فضل حق خیر آبادی (فوٹو اسٹیٹ کاپی) مملوکہ حکیم محمود احمد برکاتی (کراچی)
۱۷۔ پنج آہنگ (مرزا غالب) ترجمہ محمد عمر مہاجر (ادارہ یادگار غالب ۱۹۶۹ء)
۱۸۔ تاریخ اودھ جلد پنجم، حکیم نجم الغنی خاں، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۹ء)
۱۹۔ تاریخ ٹونک، اصغر علی آبرو، آگرہ ۱۳۱۷ھ
۲۰۔ تاریخ جھجر، منشی غلام نبی تحصیلدار، مطبع فیض احمدی جھجر ۱۸۶۶ء
۲۱۔ تاریخ دیوبند، مولوی محبوب رضوی (علمی مرکز دیوبند ۱۹۷۲ء)
۲۲۔ تاریخ راجگانِ ہند، حکیم نجم الغنی خاں، ہم دم برقی پریس، لکھنؤ ۱۹۲۷ء
۲۳۔ تاریخ سلطان العلماء، مولوی آغا مہدی، کراچی ۱۹۶۷ء
۲۴۔ تاریخ ضلع روہتک، رائے بہادر پنڈت مہاراج کشن (وکٹوریہ پریس لاہور ۱۸۸۴ء)
۲۵۔ تاریخ قصبہ تھانہ بھون، مولانا شیخ محمد تھانوی مرتبہ ثناء الحق (البلاغ کراچی شوال ۱۳۹۲ھ)
۲۶۔ تبرکات (مجموعہ مکاتیب حاجی امداد اللہ و مولانا رشید احمد گنگوہی) مرتبہ و مترجمہ مولوی نور الحسن راشد کاندھلوی (کاندھلہ ۱۹۷۶ء)
۲۷۔ تذکرۃ الکرام (تذکرہ علمائے امروہہ) محمود احمد عباسی (جید برقی پریس دہلی ۱۹۳۲ء)
۲۸۔ تذکرہ علمائے حال، مولوی محمد ادریس نگرامی
۲۹۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل، مولوی عنایت اللہ (لکھنؤ ۱۹۳۰ء)
۳۰۔ تذکرہ علمائے ہند (رحمان علی) مترجمہ و مرتبہ محمد ایوب قادری (کراچی ۱۹۶۱ء)
۳۱۔ تذکرہ غوثیہ (ملفوظات و روایات و حکایات شاہ غوث علی قلندر) مرتبہ شاہ گل حسن

قادری (اللہ والے کی قومی دکان، لاہور)

۳۲۔ تذکرۂ کاملانِ رام پور، احمد علی خاں شوق (ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء)

۳۳۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری، محمد علی حیدر (اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء)

۳۴۔ تلامذۂ غالب، مالک رام (مرکز تصنیف و تالیف نکودر ۱۹۵۷ء)

۳۵۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) محمد ایوب قادری (پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء)

۳۶۔ حالاتِ مشائخ کاندھلہ، مولوی احتشام الحسن (دہلی ۱۳۸۳ھ)

۳۷۔ حدیقۂ شہدائے مرزاجان، مطبع احمدی مدراس ۱۳۰۰ھ

۳۸۔ حیاتِ حافظ رحمت خاں، سید الطاف علی بریلوی (کراچی ۱۹۶۳ء)

۳۹۔ حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالی (اکادمی پنجاب، لاہور ۱۹۵۷ء)

۴۰۔ خطوطِ غالب، غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور

۴۱۔ خیر آباد کی ایک جھلک، مولوی نجم الحسن خیر آبادی (لکھنؤ ۱۹۶۰ء)

۴۲۔ دورِ ایام، علی اصغر ناظم (ٹونک ۱۹۲۴ء)

۴۳۔ سوانح عمری مولانا برکات احمد ٹونکی، مولوی حکیم محمد احمد (خطی، مملوکہ حکیم محمود احمد برکاتی (کراچی)

۴۴۔ سوانح ابوالبرکات حکیم دائم علی، مولوی حکیم محمد احمد (خطی، مملوکہ حکیم محمود احمد برکاتی (کراچی)

۴۵۔ شبہ لزوم لزومات اعتباریہ فی العقول المجردہ (مجموعہ تحریرات مولانا فضل حق، مفتی صدر الدین، مولانا فضل رسول بدایونی و مولوی محمد حسن خاں بریلوی (خطی، مخزونہ رضا لائبریری، رام پور)

۴۶۔ شجرہ فیض علم مفتی الٰہی بخش مرتبہ مولوی نور الحسن راشد کاندھلہ ۱۹۸۰ء)

۴۷۔ شمع انجمن، نواب صدیق حسن خاں، مطبع شاہجہانی بھوپال۔

۴۸۔ صبحِ گلشن، نواب علی حسن خاں، مطبع شاہجہانی بھوپال

۴۹۔ طوالع الانوار، مولوی انوار الحق بدایونی (سیتاپور ۱۲۸۹ھ)
۵۰۔ عربی ادبیات میں پاک ہند کا حصہ، ڈاکٹر زبید احمد (ترجمہ شاہد حسین رزاقی) ادارہ ثقافت الاسلامیہ، لاہور ۱۹۷۳ء
۵۱۔ فتاوی عزیزی (فارسی) شاہ عبدالعزیز دہلوی (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۱ھ)
۵۲۔ فتاویٰ عزیزی (اردو ترجمہ) شاہ عبدالعزیز دہلوی (مطبع مجیدی کانپور)
۵۳۔ فتاویٰ مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی (مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۰۴ء)
۵۴۔ فضل حق خیرآبادی اور سنہ ستاون، حکیم محمود احمد برکاتی (برکات اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۵ء)
۵۵۔ قیصر التواریخ، کمال الدین حیدر حسینی، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۰۷ء)
۵۶۔ کارنامہ راجپوتاں، حکیم نجم الغنی خاں، پنجابی گزٹ پریس بریلی۔
۵۷۔ کارنامہ سروری (خود نوشت حالات سرور جنگ) مرتبہ نواب ذوالقدر جنگ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ۔
۵۸۔ کلیات نثر غالب، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۱ء
۵۹۔ گلستان سخن، مرزا قادر بخش صابر، مطبوعہ دہلی
۶۰۔ مختصر سیر گلشن ہند، بابو رام، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۸ء
۶۱۔ مراسلات احمدی (مجموعہ مکاتیب شیخ احمد شروانی (خطی مملوکہ محمد ایوب قادری کراچی)
۶۲۔ مظہر العلماء، مولوی محمد حسین سید پوری (العلم، کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء)
۶۳۔ مقالات طریقت، محمد عبدالرحیم ضیاء (حیدرآباد دکن ۱۲۹۲ھ)
۶۴۔ مکاتیب غالب، مرتبہ امتیاز علی عرشی (رام پور ۱۹۴۹ء)
۶۵۔ مکتوب مولانا فضل حق خیرآبادی بنام مفتی سلطان حسن بریلوی (خطی مخزونہ نیشنل میوزیم آف پاکستان کراچی۔)
۶۶۔ نزہتہ الخواطر، جلد ہفتم و ہشتم، حکیم عبدالحئی لکھنوی (حیدرآباد دکن ۱۹۷۰ء)

۶۷۔ واقعات، دار الحکومت دہلی، بشیر الدین احمد (دہلی ۱۹۱۹ء)

۶۸۔ وقائع راجپوتانہ، منشی جوالا سہائے، آگرہ، ۱۸۷۰ء

۶۹۔ وقائع عبدالقادر خانی (علم و عمل) مرتبہ محمد ایوب قادری (ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۰ء

۷۰۔ وقائع کوہستان، منشی فضل عظیم، مطبع مصطفائی دہلی ۱۲۶۹ھ

۷۱۔ وقائع نصیر خانی (مشمولہ علم و عمل جلد دوم) مرزا نصیر الدین برلاس، مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری (ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۹۶۱ء)

۷۲۔ بریلی کے خاندانِ مفتیان کی شاعری کا مختصر جائزہ، ڈاکٹر لطیف حسین ادیب (معارف، اعظم گڑھ، اگست ۱۹۶۷ء)

۷۳۔ تذکرہ علمائے رام پور، مولانا عبدالجلیل نعمانی (البلاغ بمبئی، فروری ۱۹۵۷ء)

۷۴۔ مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد، مولانا امتیاز علی عرشی، (تحریک دہلی، اگست ۱۹۵۷ء)

۷۵۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، مالک رام (تحریک دہلی، جون ۱۹۶۰ء)

76. *Fifty Seven*,
by Kean, H.G. (London, 1883).

77. *Red Year : the Indian Rebellion of 1857*,
by R.M. Edwardes (London, 1975).

مولانا فضل حق خیر آبادی

اور

۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد

مولانا امتیاز علی عرشی

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جن اہل علم نے سزا بھگتی اُن میں مولانا فضل حق خیر آبادی بھی شامل ہیں۔ مولانا عبدالشاہد خان شروانی نے "باغی ہندوستان" میں لکھا ہے۔[1]

علامہ فضل حق کو بھی باغی قرار دیا گیا۔ اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے۔ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ علامہ کے ثبات، استقلال، صداقت، حقانیت اور بلند ہمتی و شیر دلی کے لیے سیر العلماء کی یہ عبارت کافی ہے۔

۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل مولانا خود بحث کرتے تھے، بلکہ لطف

---

[1] باغی ہندوستان نام ہے۔ مولانا خیر آبادی کے ایک عربی رسالے موسوم بہ رسالہ غدریہ کے مترجم ایڈیشن کا۔ یہ ترجمہ مع ایک مفصل دیباچے کے اس کے مترجم مولانا شروانی نے ۱۹۴۷ء (حاشیہ صفحہ ہذا آئندہ صفحہ پر)

یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی ونقلی دلائل سے توڑ دیے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصے کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی عظمت و تبحر سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے، ظاہر یہ تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے ــــــ دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لیے تھے۔ ایک ایک کر کے سب رد کر دیے۔ جس مخبر نے فتوے کی خبر کی تھی۔ اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی، فرمایا:

"پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری رائے وہی ہے"

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ مخبر نے عدالت کا رخ اور علامہ کی بارعب اور پُر وقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں، وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسن صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا۔ مگر علامہ کی شان استقلال کے قربان جایئے۔ خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے، وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔

(بقیہ حاشیہ) میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کرایا تھا۔ اب یہ نسخہ کم یاب ہے۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے حبس دوام لبعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سُنا۔

علامہ کے استاد بھائی اور رفیق خاص مفتی صدر الدین صاحب آزردہ صدر الصدور دہلی نے بھی علامہ کی خاطر سے فتوے پر "شہدت[لہ] بالجر" لکھ کر دستخط کر دیے تھے۔ گرفتاری کے بعد مفتی صاحب نے بتایا کہ میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جبراً دستخط کرنا پڑ رہے ہیں۔ بالجر پر نقطے نہ لگائے تھے۔ علمائے وقت نے اسے بالخیر پڑھا اور مفتی صاحب نے بالجبر بتا کر جان چھڑائی، البتہ جائیداد و املاک کا کافی حصہ ضبط کر لیا گیا۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

بلند ہمتی کی سعادت ہر شخص کے حصے میں نہیں آیا کرتی۔

نہ ہر درخت تحمل کند جفای خزاں
غلام ہمت سروم کہ ایں قدم دارد

لہ۔ یہ جملہ معنوی اعتبار سے محل نظر ہے کیونکہ جہاں تک میرا علم ہے۔ فتوے کی توثیق کرتے ہوئے یہ لفظ استعمال نہیں کیے جاتے بلکہ اس کی جگہ کوئی ایسا جملہ جس کا مطلب مجیب کی رائے کو درست بتانا ہو لکھا جاتا ہے۔ بہر حال اس سے آئندہ بحث کی جائے گی۔

مولانا شروانی کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ مولانا خیرآبادی پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انھوں نے جہاد کا فتویٰ لکھ کر مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے خلاف اور سلطنتِ مغلیہ کے ساتھ وفاداری پر آمادہ کیا۔

۲۔ مولانا پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور انھیں صفائی پیش کرنے کا پورا موقع ملا تھا۔

۳۔ مولانا نے اپنی صفائی پیش بھی کی تھی اور خود بحث کر کے اپنی برأت ثابت بھی کر دی تھی۔

۴۔ ایک اسپیسر بھی مولانا کی رہائی کا مؤید تھا۔

۵۔ جج بھی جو مولانا کا شاگرد تھا، ازراہِ ہمدردی مولانا کو چھوڑ دینا ہی چاہتا تھا۔

۶۔ گواہ نے بھی کہہ دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں ہیں۔ وہ دوسرے تھے۔

۷۔ مگر دوسرے دن مولانا نے نشانِ استقلال اور بلند ہمتی دکھائی اور اپنے فتوے جہاد لکھنے کے جرم کا اقرار کر لیا اور باوجودیکہ۔

۸۔ جج نے مولانا کو بار بار روکا مگر وہ اپنی بلند ہمتی کے باعث اپنے اقرار پر جمے رہے۔

۹۔ مجبوراً جج نے حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم دے دیا۔

جہاں تک واقعات تاریخی کا تعلق ہے ان شقوں میں سے اکثر محتاجِ ثبوت ہیں بلکہ مولانا کے رسالہ غدریہ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا کا بیان ان کے خلاف ہے۔

(۱) سب سے پہلے فتویٰ جہاد کو لیجئے، جو مولانا کے سزایاب ہونے کی بنیاد ہے، مولانا شروانی نے اسی کتاب کے صفحہ ۱۵۶ پر لکھا ہے:

> علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے مشورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی

عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی
وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کر دیے۔
اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی
میں لوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔"

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جنرل بخت خاں کے مشورے کے بعد مولانا خیر آبادی نے جامع مسجد میں تقریر کر کے علماء کو جہاد کا فتویٰ دینے پر آمادہ کیا۔

چونکہ مولانا شروانی نے یہ مطالب مولانا ذکاء اللہ دہلوی کی تاریخ سے نقل فرمائے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ بھی پڑھ لیے جائیں۔ مولانا ذکاء اللہ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ (ج ۵ ص ۶۷۵) میں فرماتے ہیں:

"سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے وہ بڑے فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے، اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی، بلکہ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن کو چلا گیا۔

جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا جہاد کے فتوے کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ مساجد میں ممبروں پر جہاد کا وعظ کم تر ہوتا تھا۔ دہلی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندان تیموریہ کو ایسا خوار خبطہ جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا ہے کہ وہ جانبر نہیں ہو گی۔ یہ کام لچے شہدے مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے۔

مگر جب بخت خان جس کا نام اہل شہر نے کم بخت خاں رکھا تھا، دہلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھا یا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لیے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہو گی تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتویٰ پر دستخط و مہریں ان کی کرالیں اور مفتی صدر الدین نے بھی اُن کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی۔ لیکن مولوی محبوب علی و خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں اور بیباکانہ کہہ دیا کہ شرائط جہاد موافق مذہب اسلام موجود نہیں۔ اس فتوے کا اثر یہ تھا کہ جاہل مسلمانوں میں جوش مذہبی زیادہ ہو گیا۔ جن مولویوں نے فتوے پر مہریں کی تھیں، وہ کبھی پہاڑی پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے۔ مولانا نذیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے، ان کے گھر میں تو ایک میم چھپی بیٹھی تھی۔ اس فتوے پر کچھ مہریں اصلی کچھ جعلی تھیں۔ ایک مولوی کی مہر تھی جو غدر سے پہلے قبر میں سو چکا تھا۔"

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ تنہا بخت خاں فتوے جہاد کا ذمہ دار ہے اور اسی نے جامع مسجد میں تمام مولویوں کو جمع کر کے فتوے پر دستخط کرائے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ کی اسی تاریخ (جلد ۵ صد ۶۸۱) سے پتہ چلتا ہے کہ "جولائی کے شروع میں بخت خاں بڑی سلیقہ مندی اور ہوشیاری سے دہلی میں آیا" لہٰذا فتویٰ جہاد کو ماہ جولائی سے پہلے معرض وجود میں نہ آنا چاہیے۔ مولانا شروانی نے اپنی کتاب (صد ۱۵۵) میں منشی جیون لال کے روزنامچے سے نقل کیا ہے کہ ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کو مولانا خیر آبادی شریک دربار ہوئے اور اشرفی نذر میں پیش کی اور صورت حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ علامہ الور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی

پہنچے"۔ (ص ۱۵۴) اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کے بعد مذکورہ بالا فتویٰ مرتب ہو کر شائع ہوا۔

ابھی حال میں ڈاکٹر اطہر عباس صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی ہندی کتاب "سوتنتر دہلی" ۱۸۵۷ء کی یادگار میں حکومت یو۔ پی نے شائع کی ہے۔ اس کے آخر میں بہت سے اہم کاغذات کے عکس بھی چھاپ دیے گئے ہیں۔ ان کے منجملہ صادق الاخبار دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کا فوٹو بھی ہے۔ اس کے ایک صفحہ پر فتویٰ جہاد بھی موجود ہے۔ مدیر اخبار نے اس فتوے کی سرخی یہ دی ہے "نقل استفتاء از اخبار الظفر دہلی اردو" اور اس کے بعد حسب ذیل عبارت نقل کی ہے۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلّی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں اور لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں۔ بیان کرو اللہ تم کو جزائے خیر دے۔"

جواب: درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں

تو اس صورت میں ان پر بھی فرض ہو جاوے گا۔ اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہو گا۔ اور جو عدوان بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا۔ بشرطیکہ ان کی طاقت کے۔

العبد المجیب احقر نور جمال عفی عنہ۔

اس جواب کے نیچے حسب ذیل ۳۳ علماء کے دستخط ہیں:

(۱) محمد نذیر حسین (۲) رحمت اللہ (۳) مفتی صدر الدین (۴) مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی (۵) محمد ضیاء الدین (۶) عبد القادر (۷) احمد سعید احمدی (۸) محمد میر خاں۔ (یا میر محمد خاں) (۹) محمد عبد الکریم (۱۰) سکندر علی (۱۱) محمد کریم اللہ (۱۲) مولوی عبد الغنی (۱۳) محمد علی (۱۴) فرید الدین (۱۵) محمد سرفراز علی (۱۶) سید محبوب علی جعفری (۱۷) محمد حامی الدین۔ (۱۸) سید احمد علی (۱۹) الٰہی بخش (۲۰) محمد مصطفےٰ خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی (۲۱) محمد انصار علی (۲۲) مولوی سعید الدین (۲۳) حفیظ اللہ خاں (۲۴) محمد نور الحق (۲۵) سراج العلماء ضیاء الفقہاء مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی صاحب (۲۶) اللہ الغنی وانتم الفقراء (۲۷) حیدر علی (۲۸) سیف الرحمٰن (۲۹) سید عبد الحمید (۳۰) محمد ہاشم (۳۱) سید محمد (یا حافظ کو مربع لکھ کر بیچ میں نام لکھا ہے) (۳۲) محمد امداد علی (۳۳) خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسینی۔

اس سے دو باتیں بالکل متعین ہو جاتی ہیں:

۱۔ پہلی یہ کہ زیر بحث فتویٰ ۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء سے پہلے اخبار الظفر دہلی میں اور اس تاریخ کو صادق الاخبار دہلی میں شائع ہوا تھا۔ جبکہ مولانا خیر آبادی کو دہلی میں آنے کے لیے ابھی کم از کم بیس دن درکار تھے

۲۔ دوسری یہ کہ چونکہ یہ فتویٰ مولانا کے ورود دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا

تھا۔ اس لیے اس پر مولانا خیر آبادی کے دستخط نہیں ہو سکتے تھے۔

اس کے بعد مولانا خیر آبادی کا اپنا بیان پڑھیے وہ رسالۂ غدریہ (صہ ۳۶۴) میں فرماتے ہیں:

"یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علما و زہاد اور آئمۂ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال و قتال (اور غزا و جہاد) کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔"

اس بیان میں مولانا نے علماء زہاد اور آئمۂ اجتہاد کے فتویٰ دینے کا تو ذکر کیا ہے مگر اپنا حوالہ بالکل نہیں دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شریک فتویٰ بھی ہوتے تو جیسا کہ آگے چل کر (صہ ۳۷۸) ارباب حکومت کو اپنے مشورے دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں یہاں بھی فتوے کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور کرتے اور اس شق کے ثابت ہو جانے کے بعد پھر شق نمبر ۲ کو بھی کالعدم ماننا چاہیے۔ ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا خیر آبادی کے خلاف گواہی دینے والے نے نہیں بلکہ خود مولانا خیر آبادی نے غیر شرعی شوقِ شہادت سے مجبور ہو کر ایسا جھوٹ بولا تھا جو اگر باور کر لیا جاتا اور اس کے مطابق انھیں پھانسی کی سزا دیدی جاتی تو وہ ایک طرح کی خودکشی کے مرتکب قرار پاتے۔

۲۔ اب شق نمبر دو اور تین کو لیجئے۔ خود مولانا شروانی نے سیر العلماء کی جو عبارت نقل کی ہے۔ اُس سے یہ بات ثابت ہے کہ مولانا پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا تھا، مولانا نے اُس مقدمے کی بھرپور پیروی کی تھی، اور ان کے بڑے بیٹے مولانا عبدالحق خیر آبادی کی درخواست پر مولوی نبی بخش صاحب، مولوی قادر بخش صاحب اور مولوی سید ضامن حسین صاحب شہادت صفائی کے لیے لکھنؤ گئے تھے، اور منشی کرم احمد خیر آبادی اس مقدمے کے پیروکار تھے۔

اگر مولانا خیر آبادی کا منشا ہی سزا پانا ہوتا تو وہ یہ سب کچھ کیوں کرتے اور اگر ان کی

خواہش کے خلاف ان کے بیٹوں اور اعزا و احباب کی طرف سے کیا گیا ہوتا تو خود اپنی برأت ثابت کرنے کے لیے عدالت میں بحث نہ کرتے اور کم از کم اس لطف کی بات کے موجد تو ہرگز نہ ہوتے کہ خود ہی چند الزام اپنے اوپر قائم کرتے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیتے۔

یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نے عدالت میں جو کچھ اپنی صفائی میں کہا سُنا اور جس قدر سعی و کوشش اُن کے اعزا نے کی، اس سے مقصود انگریزوں کے ظلم و ستم کو اور نمایاں کرنا اور دنیا کو یہ دکھانا تھا کہ باوجود مولانا کی برأت ثابت ہوجانے کے انھیں ظلماً سزا دی گئی مگر مولانا شروانی کا یہ ارشاد کہ مولانا خیرآبادی نے سب کچھ ثابت کر دینے کے بعد خود ہی اقرارِ جرم کر لیا، اس جواب کو رد کر دیتا ہے، کیونکہ اس اقرار سے انگریزی حکام کی بیداد کا مطلق اظہار نہیں ہوتا۔

۳۔ رہی یہ بات کہ جج مولانا کا ہمدرد تھا اور چاہتا تھا کہ انھیں بری کر دے۔ تو یہ بات خود مولانا خیرآبادی کے بیان کے خلاف ہے۔ وہ رسالہ غدریہ (ص ۴۱) میں فرماتے ہیں کہ:

> "میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا۔ اس ظالم حاکم نے میری جلا وطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا اور میری کتابیں، جائیداد، مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔"

۴۔ یہی صورت احوال مولانا شروانی کے اس ارشاد کی ہے کہ مخبر نے عدالت کا رُخ اور علامہ کی بارعب و پُر وقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں، وہ دوسرے تھے کیونکہ مولانا خیرآبادی نے مذکورہ بالا بیان میں یہ بھی فرمایا ہے کہ:

> "میری چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تند خو افراد نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی

محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ تھا کہ یہ نصاریٰ کا دوست
بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودّت ومحبت پر مصر تھے۔
انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔"

اگر مخبر عدالت میں مولانا کے حق میں گواہی دے چکا تھا تو مولانا کا جزائر انڈیمان میں بیٹھ کر اُسے مرتد، جھگڑالو اور تند خُو کہنا، ان کی شان کے قطعاً خلاف تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی واقعے کے خلاف ہے۔

۵۔ جہاں تک مولانا خیر آبادی کے استقلال اور بلند ہمتی کا تعلق ہے، اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ شوقِ شہادت میں ناکردہ گناہ سزا پانا چاہتے تھے، تو یہ ان کے تمام صاف اور صریح بیانوں کے خلاف ہے۔ وہ قصیدۂ ہمزیہ میں افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو
جانے پر خود بیٹھ رہا۔ میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز
رہا۔ یہ میں نے بڑا جرم کیا۔ پس جبکہ نیک بخت حضرات شہید ہوئے
تو میں شہادت سے محروم رہا۔ اے پروردگار! میرے قصور کو
معاف کر، تجھ سے عفو و درگزر ہی کی امید ہے۔"

اور اگر یہ کہا جاوے کہ انھوں نے تلافی مافات کے خیال سے اب شہید ہونے کی تدبیر نکالتے ہوئے، اقرار تحریر فتویٰ کیا تھا۔ تو یہ بھی درست نہیں، کیونکہ انھوں نے اپنے دونوں قصیدوں اور رسالہ غدریہ میں جگہ جگہ نصاریٰ کے ظلم و استبداد، ملکہ وکٹوریہ کے غدر و مکر اور مخبروں کے جھوٹ اور فریب کو اپنے تمام مصائب کا سبب قرار دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے بیحد تضرع وزاری کے ساتھ دعائیں کی ہیں کہ وہ انھیں قید اور اس کے عذابوں سے جلد از جلد نجات دے کر بخیر و عافیت اہل و عیال تک واپس پہنچا دے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مولانا خیر آبادی نے خود اقرار جرم کیا، اور خوشی خوشی قید و بند کے مصائب کو اپنے اوپر

لاداکسی طرح بھی اُن کے خیالات کی ترجمانی نہیں ہے۔

خوش قسمتی سے کتاب خانۂ رام پور میں مولانا خیرآبادی کا ایک خط محفوظ ہے۔ اس سے مولانا کے اسباب قید و بند اور مدارج سعی و کوشش رہائی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں اسے نقل کیا جاتا ہے تاکہ اہل تاریخ صحیح صورتحال سے آگاہ ہوجائیں۔ خط یہ ہے:

جنابِ عالی جناب نواب صاحب خداوند نعمت، فیاض زماں، ملاذ و معاذِ علمائے دوراں دام اقبالہٗ

بعد عرض می رساند کہ پیش ازیں دو تا عریضۂ عقیدت مشتمل بر ابتلائے خویش ارسال عالی جناب کردہ ام۔ بنظرِ اشرف گذشتہ کاشف فحاویٔ مندرجہ شدہ باشد۔ دریں روبکاری ایں جا واضح شد کہ فدوی را بعلت نوکریٔ خان بہادر خان و نظامت پیلی بھیت و چکلہ داریٔ محمدی و افسریٔ لشکرِ باغی ماخوذ کردہ اند، حال آنکہ فدوی ازیں ہر سہ امر محض بری است و منشاءِ مواخذہ آنست کہ شخصے میر فضلِ حق نام از سادات شاہجہان پور کہ قبل ازیں در سرکارِ ابد قرارِ بندگانِ عالی لازم ماندہ بسر رشتہ داریٔ پیلی بھیت مامور شدہ، و زمانے تحصیلدار آنولہ و پیلی بھیت ماندہ بود، در ابتدائے غدر از طرف خان بہادر خان ناظمِ پیلی بھیت گردید و بعدِ فتح بریلی در ملکِ اودھ رسیدہ از طرف خان علی خان چکلہ دارِ محمدی شدہ۔ پس از زمانے بافسریٔ کدامی لشکرِ باغی ہمراہ فیروز شاہ آں طرفِ جمن فرار کرد۔ عزیزانِ او در سرکارِ کمپنی بعہدہائے جلیلہ مامور اند۔ چنانچہ برادرِ حقیقیِ او مولوی مبین ڈپٹی کلکٹر سہارن پور بود۔

مہتمانِ اخبار خانہ خراب ناواقف ازیں تفصیل کہ اُو شخصے دیگر است و فدوی از شیوخ خیرآباد شخصے دیگر، در اخبار نامہا حال نظامت پیلی بھیت و محمدی و افسری لشکر و فرارِ اُو بافیروز شاہ آں طرف جمن نوشتہ بعض علامات فدوی افزودند کہ برادر حقیقی اُو در سرکارِ مہاراجہ پٹیالہ نوکر و برادرِ دیگرش در مہانپور ڈپٹی کلکٹر است، و حاکمانِ ایں جا بہ اشتباہ ہماں مولوی فضل حق کہ ہمنام و در بعضے علامات شریکِ فدوی است، فدوی را محض بے جرم مقید کردہ اند۔

لہٰذا عرض رسا نست کہ اسمٰعیل خان رئیسِ مالاگڑھ دریں روزہا واردِ آں دیار اند، و از حالِ فدوی و مولوی فضل حق شاہجہان پوری مذکور بخوبی واقف۔ بایشاں ایما رود تا ایشاں کیفیتِ تفصیلی مشارٌالیہ و حالِ عبرِ اُو در یابے جمن را ہمراہِ فیروز شاہ و حالِ بے جرمی فدوی نوشتہ مع عرضی خود بنام ترب صاحب کمان افسر بریلی متضمن درخواستِ ارسالِ کیفیت مذکور بذریعۂ چیٹھی خود محکمہ اسپیشل کمشنر لکھنؤ خدمت ترب صاحب موصوف روانہ دارند[۱] و در کیفیتِ تغائرِ بسیار میانِ فدوی و فضل حق شاہجہانپوری ثابت سازند، و نوکر نبودنِ فدوی بسرکار کدامی باغی و افسر نبودنِ فدوی بکدامی لشکر و ناظم نماندنِ فدوی بعلاقۂ پیلی بھیت و محمدی، ایں جملہ اُمور واقعی است، بوجہ احسن ثبت

---

[۱] یہاں عبارت کچھ گنجلک ہے۔

کنند، تا صاحب موصوف عرضی و کیفیت مرسلہ
ایشاں را ہمراہ چٹھی خود دریں جا روانہ فرمایند و بواسطہ آں چٹھی و
کیفیت اشتباہ حکام ایں جا رفع شود و نمک خوارِ قدیم رہائی
یافتہ بدعائے ترقی و جاہ (مشغول) گردد۔ از پرورش خاوندانہ
و مواسات کریمانہ امیدوار است توجہ بسیار بحالِ زارم مبذول
شود و بعجلت ہر چہ تمامتر اثرِ اجابت مسئول ظاہر گردد۔ واجب
بود، عرض نمود۔

آفتابِ ترقی جاہ و جلال ہموارہ تاباں باد

ترقی خواہ

عرضی مہر (فضلِ حق ۱۲۲۴ سنہ)

نمک خوارِ قدیم

۱۸ ر فروری

۱۔ مولانا خیرآبادی نے ابتلاء کے سلسلہ میں نواب رام پور کو تین خط لکھے تھے، چونکہ آخری خط میں اُن سے مدد کی خواہش کی گئی ہے اس لیے قیاس یہ ہے کہ پہلے دو خطوں میں بھی اسی قسم کی تمنّا کا اظہار کیا گیا ہوگا۔

۲۔ مولانا پر حسب ذیل تین الزام عائد کیے گئے تھے۔

(الف): نواب خان بہادر خان، نبیرہ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا، اور ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

(ب): جب انگریزوں نے بریلی فتح کرلی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خان کی طرف سے ریاست محمدی کے

چکلہ دار مقرر ہوئے۔

(ج): مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔

۳۔ مولانا پر جو مذکورۂ بالا تین الزام لگائے گئے تھے، یہ دراصل میر فضل حق شاہجہان پوری کے کارنامے تھے، مولانا ان سے بری الذمہ تھے۔

۴۔ مخبروں نے ہم نامی کی بنا پر دھوکا کھایا اور اپنی خفیہ رپورٹوں میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ ان کا ایک بھائی مہاراجہ پٹیالہ کا ملازم ہے، جو ایک امر واقعی تھا۔

۵۔ اگر کسی طرح ان الزاموں کا غلط ہونا یعنی ان جرموں کا میر فضل حق شاہ جہان پوری سے تعلق ثابت ہو جاتا تو مولانا بری ہو جاتے۔

۶۔ لہٰذا مولانا نے نواب صاحب سے انتہائی عاجزی وزاری کے ساتھ مدد کی التجاء کی تھی۔

۷۔ مولانا کا یہ خط ۱۸ فروری ۱۸۵۹ء کا نوشتہ ہے اور انھیں ۲۰ فروری کو حکم سزا (حبس دوام بعبور دریائے شور) سنایا گیا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ آخری وقت تک اپنی رہائی کے اسباب کی تلاش میں لگے رہے تھے۔

ان امور کے پیش نظر یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے، کہ مولانا خیر آبادی پر تحریر فتویٰ کا الزام عائد نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اُن پر غدر دہلی سے متعلق کوئی الزام بھی نہ لگا تھا۔ اور جو الزام عائد کئے گئے تھے وہ دراصل دوسرے مولوی فضل حق کے کام تھے۔ یہ ان سے بالکل بری الذمہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب عدالت میں مخبر پیش ہوئے تو بقول مولانا شروانی انھوں نے مولانا کے متعلق صاف کہہ دیا کہ یہ وہ فضل حق نہیں ہیں، وہ دوسرے تھے، مگر انگریز پر جبر کا بھوت سوار تھا۔ حاکم نے اس شبہ کا فائدہ مولانا کو صرف اتنا دیا کہ انھیں پھانسی کی جگہ حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دے دی۔

• • • •

فتویٰ جہاد کی اصلیت

پچھلے صفحات میں صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا خیر آبادی کا جہاد کے فتویٰ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اب اس پر غور کرنا ہے کہ کیا حقیقت میں جہاد کا فتویٰ دہلی کے علماء کی طرف سے چھاپا گیا تھا، یا باغی سپاہیوں نے عوام اور اہل اسلام کو اپنے ساتھ ملا کر بغاوت کو کامیاب بنانے کے لیے یہ چال چلی تھی۔

اس نقطے پر سب سے پہلے سر سید نے اپنی کتاب "اسباب سرکشی ہندوستان" (مطبع آگرہ ۱۸۵۹ء) میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دلی میں جو جہاد کا فتویٰ چھپا، وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے۔ مگر میں نے تحقیق سنا ہے اور اس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دلی میں گئی، تو کسی شخص نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس پہلے فتوے کی میں نے نقل دیکھی ہے۔ مگر جب کہ وہ اصل فتویٰ معدوم ہے تو میں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک لائق اعتماد کے ہے"

"مگر جب بریلی کی فوج دلی میں پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے، بلاشبہ اصلی نہیں۔ چھاپنے والے اس فتوے کے جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی بدذات آدمی تھا، جاہلوں کو بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دیا تھا۔ بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔ مگر مشہور

ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اُس کے مفسد ہمراہیوں
کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں۔"

مولانا نے یہ عریضہ لکھنؤ سے نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رام پور کو لکھا تھا۔ چونکہ نواب صاحب کا رویہ انگریزوں کے موافق رہا تھا۔ اس لیے یہ اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ کوشش اور سفارش کریں گے تو انگریزی قید و بند سے نجات مل سکے گی، اسلیئے مولانا نے انھیں یکے بعد دیگرے تین خط لکھے، پہلے دو خط محفوظ رہے یا محفوظ نہ رکھے گئے۔ تیسرا خط پہلی بار اہلِ تاریخ کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔

اس خط سے حسب ذیل اُمور ہمارے علم میں آتے ہیں:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ آغاز سرکشی میں دہلی کے علمائے سے فتویٰ مانگا گیا، تو انھوں نے عدمِ وجوب کا فتویٰ دیا۔

۲۔ اس فتوے کی نقل سرسید نے بچشمِ خود دیکھی تھی۔

۳۔ مگر فوج بریلی کے ورود کے بعد ایک مفسد نے وجوب جہاد کا فتویٰ بہت سے اہلِ علم کی مہروں کے ساتھ شائع کیا۔

۴۔ یہ فتویٰ جعلی تھا۔ اس لیے کہ اس پہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی بھی چھاپی گئی تھی، جو قبل غدر مر چکا تھا۔

۵۔ مشہور یہ ہے کہ کچھ عالموں نے جبر اور ظلم کے تحت اپنی مہریں لگا دی تھیں۔

سرسید کے بعد مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے "تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ" (ج ۵ ص ۶۷۵) میں اس فتوے کا ذکر کیا ہے۔ ان کی مطلوبہ عبارت آغازِ مضمون میں نقل کی جا چکی ہے یہاں صرف ضروری حصہ نقل کرنا کافی ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"جب بخت خاں ـــــ دہلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھا کہ
مسلمانوں پر جہاد ـــــ فرض ہے۔ ـــــ اُس نے جامع

مسجد میں مولویوں کو جمع کرکے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں اُن کی کرالیں۔ اور مفتی صدر الدین نے بھی اُس کے جبر سے اپنی جعلی مہر کردی۔ لیکن مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں۔ ــــــــ اس فتوے پر کچھ مہریں اصلی، کچھ جعلی تھیں۔ ایک مولوی کی مہر تھی جو غدر سے پہلے قبر میں سو چکا تھا۔"

اس عبارت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ فتویٰ جبراً حاصل کیا تھا، اسی لیے کچھ مہریں جعلی ہیں، اور جو اصلی ہیں وہ خود اختیاری نہیں بلکہ جبری ہیں۔ چونکہ سرسیّد نے اس زمانے میں یہ کتاب لکھی تھی جب انگریز قوم سخت برہم تھی اور ان کا مقصد اس قوم کے غصّے کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے پہلے عدم وجوب کے فتوے کا ذکر کیا، اور پھر وجوب کے فتوے کو بے اصل ٹھہرا کر اہل علم کی صفائی پیش کر دی۔ مولوی ذکاءاللہ صاحب کا منشاء بھی علمائے اسلام کو انگریزوں کے کینے سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس لیے انھوں نے بھی سرسید کی ہمنوائی کرکے جعل اور جبر کی سپر سامنے کردی۔ لیکن اس وقت کے حالات کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دستخط کرنے والوں میں کچھ اہل علم ایسے بھی تھے جو دل و جان سے انگریزی تسلط کے مخالف تھے۔ اور انگریزوں کے خلاف جنگ کو مذہباً ضروری جانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہ فتویٰ مرتب کیا۔ اور اپنے اختیار اور رضامندی سے دستخط کیے۔ بقیہ نے مجبوراً توثیق کی۔ شکست کے بعد جان بچانے کی صرف یہی ایک تدبیر باقی تھی کہ جبر کی پناہ لی جائے۔ اس بناء پر جس سے بازپرس ہوئی اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

اس کے ثبوت میں مولانا خیر آبادی کی حسبِ ذیل عبارت دوبارہ پڑھیے کہ:

"بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء و زہاد اور آئمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر غزاو جہاد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔"

اگر فتویٰ مطلقاً "جعلی و جبری ہوتا تو مولانا اپنی نجی روداد غم میں اس امر کا ضرور تذکرہ کرتے یا کم از کم ایسا پرداز اختیار نہ کرتے، جس سے فتوے کے اصلی ہونے کا یقین ہوتا ہے۔

آزردہ اور جبر

مولانا شروانی نے صدر الدین خاں آزردہ کے فتوے پر دستخط کرنے کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، اور اس سے مولانا خیرآبادی کی بلند ہمتی اور آزردہ کی پست ہمتی و عیاری کا جو نتیجہ نکالا ہے، اس سے قطع نظر کرتے ہوئے مجھے اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ جو لکھا ہے کہ آزردہ نے فتوے پر دستخط کرنے سے پہلے "شہدت بالجبر" لکھ دیا تھا۔ یہ بات دو وجوہ سے درست نہیں۔

۱۔ پہلی یہ کہ یہ موقع گواہی کا نہ تھا جو آزردہ "شہدت" لکھتے، بلکہ توثیق جواب کا تھا۔ اس لیے کم از کم "کتبت" لکھنا چاہیے تھے۔ جس کا مطلب تھا میں نے لکھا۔

۲۔ دوسری یہ کہ فتوے کی جو نقل صادق الاخبار میں چھپی ہے اس میں مولانا کی مہر کے آگے پیچھے سرے سے کوئی عبارت ہی نہیں ہے۔

اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ "شہدت بالجبر" واقعہ نہیں ہے لطیفہ ہے۔

مولانا خیرآبادی کی دوسری بیوی کا نام

آخر میں اتنا اور کہہ دوں کہ کتاب خانہ رام پور میں ایک فارسی خط مولانا خیرآبادی کی دوسری بیوی کا بھی محفوظ ہے، جو انھوں نے ۹ رصفر ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) کو نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں والیٔ رام پور کے نام لکھا تھا۔ اور اپنی مالی پریشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سے امداد چاہی تھی۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خاتون کا نام امراؤ بیگم تھا۔ اور اس زمانے میں وہ دہلی کے اندر محلہ بلی ماران۔ بارہ دری شیر افگن خاں میں رہتی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے اُن کے بطن سے دو بیٹے تھے جن کے نام محمد شمس الحق اور محمد علاء الحق تھے۔

مالک رام

مولانا فضلِ حق خیر آبادی

مولانا فضلِ حق خیر آبادی (۱۷۹۷ - ۱۸۶۱ء) اپنے عہد کے مشہور علماء میں سے تھے، بلکہ معقولات میں تو آخری دور کے امام مانے جاتے ہیں۔ یہ امتیاز ان کے خاندان میں بہت دن تک جاری رہا اور آج تک ان کا نام علمی اور تعلیمی حلقوں میں ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔

اگر اسی پر اکتفا کر لیا جاتا تو یہ بھی کچھ کم امتیاز نہیں تھا۔ لیکن ان کے مداحوں نے اس پر قناعت نہ کی اور چاہا کہ انھیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ہیرو اور "افضل الجہاد کلمۃ الحق عند سلطان جائر" کا مصداق بھی قرار دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں ان پر جو مقدمہ قائم ہوا تھا اور جس میں آخرکار انھیں کالا پانی کی سزا ہوئی تھی، اس کی روداد کچھ ایسے انداز سے لکھی گئی کہ اس میں تاریخ سے زیادہ ڈراما کا لطف پیدا ہو گیا۔

سب سے پہلے ان کے مقدمے کی مفروضہ کارروائی اور اس میں ان کے مشہور دفاع سے متعلق شبہ اس وقت پیدا ہوا جب مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اپنے مضمون "مولانا فضلِ حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد" [۱] میں مولانا مرحوم کا ایک خط شائع کیا، جو انھوں نے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور کو لکھا تھا۔ اس خط سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف انھوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک

---

[۱] مشمولہ تحریک، اگست ۱۹۵۷ء

میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ وہ آخر تک اس سے اپنی بے تعلقی اور عائد کردہ الزامات سے بے گناہی ثابت کرنے کے لیے پوری تگ و دو کرتے رہے۔

ان کے مقدمے کی جو کیفیت آج تک شائع ہوئی ہے[۱]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ مولانا فضل حق مرحوم پر یہ مقدمہ "سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتوی جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت" کی بناء پر قائم ہوا تھا۔

۲۔ جس جج کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تھا، وہ ان کا شاگرد تھا؛ اس لیے اُسے ان سے ہمدردی تھی اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ یہ بُری ہو جائیں۔

۳۔ جیوری میں ایک اسپنسر بھی مولانا کو بُری کر دینے کے حق میں تھا۔

۴۔ مولانا فضل حق نے خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیے تھے اور امید تھی کہ وہ بُری کر دیے جائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے خود اقرار کیا کہ جس فتوے کی بناء پر یہ مقدمہ قائم ہوا ہے "وہ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے؛ اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔"

---

[۱] دیکھیے "باغی ہندوستان" از مولانا محمد عبدالشاہد خاں شروانی، ص ۱۶۸-۱۷۲ (مدینہ پریس، بجنور- ۱۹۴۷ء)

معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مندرجات "سیر العلماء" مصنفہ مولانا بہاؤ الدین گوپاموی کی کتاب پر مبنی ہیں، لیکن یہ موخر الذکر تالیف میری نظر سے نہیں گزری۔

۵۔ اس اقرار و اقبال کے بعد عدالت نے بیحد رنج کے ساتھ"
حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کا حکم سُنایا۔

۶۔ یہ فیصلہ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سُنا۔

افسوس کہ واقعات سے یہ تمام دعاوی ٹھیک ثابت نہیں ہوتے۔

(۲)

مولانا فضلِ حق کے مقدمے کی ابتدائی سماعت کپتان ف۔ا۔ تھر برن F.A.V. Thurburn لکھنؤ نے کی تھی۔ یہ مقدمہ ۲۲ فروری ۱۸۵۹ء کو ان کی عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہ تھے: (۱) عبدالحکیم، اکسٹرا اسسٹنٹ، دریاباد؛ (۲) تجمل حسین (۳) فضل حسین؛ (۴) رام دیال؛ اور (۵) مرتضیٰ حسین۔

سب سے پہلے عبدالحکیم نے بیان دیا اس نے کہا:

"مئی ۱۸۵۸ء میں جن دنوں میں کارِ سرکار پر دریاباد میں متعین تھا، منظم حسین نے مجھے گرفتار کر لیا اور بیگم حضرت محل کے پاس بھیج دیا، جو ان دنوں بوندی میں مقیم تھیں۔ یہاں مجھے ممّو خاں اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا۔ ممّو خاں نے مولانا فضلِ حق سے دریافت کیا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ مولانا نے فتویٰ[۲] دیا کہ یہ شخص فرنگیوں کا ملازم ہے، اس لیے سزائے موت کا مستحق ہے؛ اسے بلا تاخیر موت کے گھاٹ اُتار دینا چاہیے۔ اس پر کاظم علی

---

[۱] اتفاق سے اس مقدمے کی مِسل حکومت کے پُرانے کاغذات میں دستیاب ہو گئی ہے۔ یہاں مقدمے کے جو کوائف لکھے گئے ہیں، وہ سب اسی سے ماخوذ ہیں ہر جگہ حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جو باتیں دوسرے ماخذ سے لی گئی ہیں، وہاں حوالہ دے دیا گیا ہے۔

[۲] یہ ہے وہ فتویٰ جو بنائے مقدمہ بنا۔ اور جس کی طرف فردِ جرم (حاشیہ صفحہ ہذا آئندہ صفحہ پر

نے، جو وہاں موجود تھا، یہ مشورہ دیا کہ اسے قتل کرنے کی بجائے قید کر دیا جائے۔ چنانچہ میں قید خانے بھیج دیا گیا۔ یہاں میں ایک مہینہ بائیس دن رہا۔ آخر کار مجھے تحمل حسین (ساکن بتر میٹو) اور بعض اور اشخاص کی سفارش پر رہائی ملی۔ اس زمانے میں مولوی فضل حق کیمپ میں موجود نہیں تھے۔ یہ مولوی احمد اللہ شاہ کی جائیداد کی ضبطی کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ وہاں ہوتے، تو مجھے کبھی رہائی نصیب نہ ہوتی۔ مولوی فضل حق، ممو خاں کے مشیر اور اس کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ چونکہ ان کا خیمہ اس خیمے کے نزدیک تھا، جس میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ اس لیے میں انھیں دیکھا کرتا تھا۔ یہ کثرت سے ممو خاں کے پاس جایا آیا کرتے تھے میں انھیں خوب پہچانتا ہوں؛ انہی نے میری موت کا فتویٰ دیا تھا۔

سوال (از مولانا فضل حق) کیا تم اپنے بیان کے ثبوت میں کوئی شہادت پیش کر سکتے ہو؟
جواب: ہاں، چودھری مرتضیٰ حسین جو میرے ساتھ قید میں تھے اور شیخ عبدالعلی (گولہ گنج والے) میری تصدیق کریں گے۔

سوال: (از مولانا فضل حق) کیا سُنّی کا فتویٰ شیعہ کے لیے قابلِ قبول ہوگا؟ لہ
جواب: "بغاوت کے دنوں میں شیعہ سُنّی کا امتیاز اُٹھ گیا تھا" عبدالحکیم کا بیان ختم ہوا تو تحمل حسین کی طلبی ہوئی۔ اس نے حسبِ ذیل گواہی دی:

(حاشیہ صفحہ سابقہ) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی مزید وضاحت مولانا نے قصیدۂ ہمزیہ میں کی ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ میں نے اسی جگہ ایک وضاحتی حاشیہ بھی لکھ دیا ہے۔

لہ۔ جیسا کہ آگے خود مولانا کے بیان سے ظاہر ہوگا؛ یہ عبدالحکیم شیعہ تھا؛ اس لیے یہ سوال کیا گیا۔

میں بحکم سرکار مئی ۱۸۵۸ء میں عبدالحکیم کی رہائی کے لیے بونڈی گیا تھا، جہاں ان دنوں ممّو خان اور حضرت محل اور برجیس قدر مقیم تھے۔ وہاں میں نے مولوی فضل حق کو باغیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ یہ ممّو خان کے مشیروں میں شمار ہوتے تھے اور اسی حیثیت سے اس کے دربار میں موجود رہتے تھے۔ میں باغی ڈیرے میں کوئی ڈیڑھ مہینہ رہا۔ مجھے وہاں پہنچے مہینہ بھر ہوا ہوگا کہ مولوی فضل حق اور میر مہدی دونوں مولوی احمد اللہ شاہ کی جائیداد ضبط کرنے کو محمدی گئے۔

میں مولوی فضل حق کو پہچانتا ہوں۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ آیا یہ باغی حکومت کے ملازم تھے یا نہیں؛ نہ مجھے اس کا علم ہے کہ ممّو خان ان پر اعتماد کرتا تھا یا نہیں۔

ہاں ایک اور فضل حق بھی ہیں۔ میں جس زمانے میں بونڈی کے باغی کیمپ میں تھا، وہ بھی دو دن کے لیے وہاں آیا تھا اور اس کے بعد خان علی خان ناظم شاہ جہاں پوری کے پاس واپس چلا گیا۔

اس زمانے میں دونوں سُنّیوں اور شیعوں کے فتوے قبول کر لیے جاتے تھے لیکن میں نے ان مولوی فضل حق کا کوئی فتویٰ نہیں دیکھا۔

استغاثے کا تیسرا گواہ فضل حسین تھا۔ اس نے مولانا فضل حق کو شناخت کیا اور کہا:۔

یہ خیرآباد کے رہنے والے ہیں۔ آج سے دس بارہ برس پہلے یہ واجد علی شاہ کے ہاں ملازم تھے۔ جب آٹھ مہینے پہلے بیگم حضرت محل، بھاگ کے بونڈی گئی ہیں، تو میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے مولوی فضل حق کو دیکھا۔ یہ وہیں قلعے کے اندر بیگم کی جائے

سکونت کے شمال کے طرف ایک عمارت میں مقیم تھے۔ میں انھیں وہاں
کوئی دو مہینے تک دیکھتا رہا یہ ممّو خان کے دربار میں روزانہ جاتے
تھے اور "مولوی خان" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔
مجھے معلوم نہیں کہ یہ بندی کیوں گئے تھے۔
اس کے بعد رام دیال گواہ پیش ہوا۔ اس نے بیان دیا۔:
"پانچ مہینے کی بات ہے کہ میں نے فضل حق کو بوندی میں دیکھا جہاں
بیگم (حضرت محل) فوج کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ یہ (مولوی
فضل حق) ممّو خان کے دربار میں حاضری دیتے تھے۔ جس دن عبد الحکیم
گرفتار ہو کر آیا ہے، میں (دربار میں) موجود تھا۔ جب عبد الحکیم اور
مرتضیٰ حسین کو ممّو خان اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا،
تو انھوں نے (یعنی مولوی فضل حق نے) ان دونوں سے پوچھا کہ تم
انگریزوں کی ملازمت کیوں کرتے ہو، عبد الحکیم نے جواب دیا کہ میں تو ان
کا ملازم ہوں اور انھی کے ساتھ رہتا ہوں۔ مرتضیٰ حسین نے مولوی فضل حق
کو قرآن سے کوئی جواب دیا تھا۔ میں نے ممّو خاں سے کہا کہ یہ دونوں موت
کے سزاوار نہیں، انھیں چھوڑ دینا چاہیے، ممّو خان نے ان کے بیان سن کر
کہا کہ عبد الحکیم کو رہا کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ یہ اپنے بھائی محمد عسکری کو
لے آئے۔ میرے سامنے کوئی فتویٰ نہیں دیا گیا، میرے آنے سے پہلے شاید دیا گیا ہو۔
اب سب سے آخری گواہ مرتضیٰ حسین حاضر عدالت ہوا۔ اس نے کہا:
"جب مجھے عبد الحکیم کے ساتھ گرفتار کیا گیا ہے تو اس کے تیسرے
یا چوتھے دن، ہمیں داروغہ ممّو خاں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسوقت
(مولوی) فضل حق اس کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ مولوی

فضل حق نے مجھ سے پوچھا: کیا تم پڑھ سکتے ہو۔ میں نے ہاں میں جواب دیا۔
اس پر انھوں نے مجھ سے کہا کہ شرعی لحاظ سے تم مرتد ہو، مرتد کا قتل جائز
ہے، انھوں نے مجھے مرتد اس لیے کہا، کیونکہ میں حکومت (انگریزی) کا ملازم
تھا۔ ممو خان نے کہا کہ کسی طرح محمد عسکری تحصیلدار نواب گنج کو توڑا جائے،
اگر وہ آجائیں تو انھیں اس سے دگنی تنخواہ دی جائے گی، جو انھیں اس
وقت ملتی ہے۔ عبدالحکیم نے جواب میں کہا کہ میں انھیں لا تو نہیں سکتا،
البتہ اس مفاد کا خط ان کے نام لکھ دے سکتا ہوں۔ اس پر سب اٹھ
کر چلے گئے اور ہمیں واپس قید خانے میں بھیج دیا۔
اس کے چار دن بعد ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔
پھر ممو خان نے مجھے مولوی فضل حق کی جائے سکونت پر بلا بھیجا اور کہا کہ
اگر تم پچاس ہزار روپیہ فوج کے خرچ کے لیے ادا کر دو، تو تمھاری جان
بچ سکتی ہے؛ اور اگر نہیں ادا کرو گے تو توپ کے منھ سے اڑا دیے
جاؤ گے۔

ممو خان، مولوی فضل حق سے بہت عزت و احترام سے پیش آتا تھا، وہ
مولوی فضل حق کے پاس خود چل کر جاتا تھا۔ مولوی فضل اس کے دربار میں
بھی آتے تھے۔

میں نے سنا تھا کہ بونڈی میں کوئی شوری بیٹھتی ہے، جس میں یہ مولوی فضل حق
بھی شریک ہوتے ہیں۔ یہ پچھلی مئی (یعنی ۱۸۵۸ء) کی بات ہے۔
میں نہیں سکتا کہ آیا مولوی فضل حق نے کوئی فتویٰ دیا تھا۔
میں دو مہینے ۲۴ دن قید خانے میں رہا اور سات ہزار روپے دے کر رہائی
حاصل کی۔ میری رہائی کے وقت مولوی فضل حق وہاں نہیں تھے۔ یہ ان ایام

میں احمد اللہ شاہ کی جائیداد ضبط کرنے کو گئے ہوئے تھے۔

میں فضل حق کو پہچانتا ہوں۔

جب ہمیں پہلی مرتبہ ممو خان کے سامنے پیش کیا گیا تو اس دن رام دیال بھی وہاں موجود تھا۔

ان گواہوں کے بیانات کا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں اور اب اس سے کوئی فائدہ بھی مترتب نہیں ہو سکتا۔ بہر حال ان کے باہمی تضاد ظاہر ہیں۔

ان میں سے عبدالحکیم اور مرتضٰے حسین، دونوں کے بیانات بہت اہم ہیں اور بعد کو یہی سارے مقدمے کی بنیاد بنے۔ دوسرے لوگوں کے بیان تو محض تائیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا فضل حق نے اپنے عربی رسالے "ثورۃ الہندیہ" میں لکھا ہے:[1]

"حاکم نصرانی کے سامنے دو مرتد، سخت دل دشمنوں نے میری چغلی کھائی۔ وہ دونوں قرآن کی آیت کے معانی سے متعلق مجھ سے حجت کرتے تھے، حالانکہ اس کا صاف حکم یہ ہے کہ جو نصاریٰ کا دوست ہے، وہ خود بھی نصرانی کے حکم میں ہے۔ وہ دونوں شخص نصاریٰ کی دوستی پر مصر تھے۔ انھوں نے ارتداد اختیار کیا اور اپنے ایمان کو کفر سے بدل لیا۔

یہاں ان دشمنوں سے یہی عبدالحکیم اور مرتضٰے حسین مراد ہیں جنھوں نے ان کے خلاف گواہی دے کر بنائے مقدمہ قائم کی تھی۔

جب استغاثہ کے سب گواہوں کے بیان قلم بند ہو چکے، تو خود ملزم یعنی مولانا فضل حق کی طلبی ہوئی اور ان کا بیان لکھا گیا۔ انھوں نے کہا:

---

[1] باغی ہندوستان ص ۱۴۷۔

"میں راجہ الور کے ہاں ملازم تھا اور بغاوت شروع ہونے کے زمانے میں اسی کے پاس تھا۔ راجہ بنے سنگھ کی وفات کے بعد ایک مہینے تک میں الور ہی رہا۔ میں اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے روانہ ہوا اور دہلی آیا۔ وہاں میں پندرہ دن رہا۔ اور پھر واپس الور چلا گیا۔

میں اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے روانہ ہوا اور دہلی آیا۔ وہاں میں پندرہ دن رہا اور پھر واپس الور چلا گیا۔ میں نے اپنے اہل و عیال کو یہاں الور میں چھوڑا اور دسمبر ۱۸۵۷ء میں خیر آباد کی راہ لی۔ جب سے میں اپنے مکان پر مقیم ہوں؛ نہ میں نے کسی کی ملازمت کی، نہ باغیوں میں شامل ہوا۔ میر فتح حسین، محمد حسین اور احمد علی خان میرے گواہ ہیں۔ نبی بخش اور قادر بخش، امام علی، علی محمد اور ممتو خان خیر آباد کے رہنے والے میرے چال چلن سے واقف ہیں۔ میں خیر آباد سے اس لیے نکلا تھا، کیونکہ یہاں کے تمام باشندے بیگم (حضرت محل) کے ساتھ بھاگ گئے تھے۔ میں یہاں سے نکل کر چند دن کھیڑی، ہرگاؤں، تنبول، سہور پور وغیرہ میں رہا۔ کچھ دن ڈربہ میں بھی گزارے۔ ۲۶ دسمبر ۱۸۵۸ء کو میں نے کرنیل کلارک سے سیبہا کے مقام پر ملاقات کی۔ اس سے پہلے میں بریگیڈیر ٹروپ سے مل چکا تھا۔ بریگیڈیر ہی نے مجھے کرنیل کے پاس بھیجا تھا۔ کرنیل کلارک نے ایک روبکار لکھی اور حکم دیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں دے دیا جائے۔ میں ۳۰ دسمبر کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے حاضر ہوا اور اپنے مکان ہی پر ٹھہرا رہا۔ ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے مجھے

بلا بھیجا اور لکھنؤ روانہ کر دیا۔

فضلِ حق ایک اور شخص کا نام ہے۔ مجھے اس کی جگہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ آج کل (شاہزادہ) فیروز شاہ (ابن بہادر شاہ ظفر) کے ساتھ ہے۔ یہ (فضل حق) سابق میں آنولہ کا تحصیلدار تھا اور اس نے خان بہادر خان اور بیگم (حضرت محل) کی ملازمت بھی کی ہے۔

وہ ذات کا سیّد اور شاہجہان پور کا رہنے والا ہے۔

یہاں مولانا فضل حق نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ میں مہاراجہ بنے سنگھ کی وفات کے بعد ایک مہینہ تک الور میں رہا اور اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے روانہ ہوا اور دہلی آیا اور پھر یہاں پندرہ دن رہ کے واپس الور چلا گیا۔ چونکہ مہاراجہ بنے سنگھ کی وفات ۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء (۹ ساون سمت ۱۹۱۴ بکرمی) کو ہوئی تھی،[1] اس لیے وہ ۱۵ر اگست کے لگ بھگ الور سے چلے ہوں گے۔

دہلی میں ان کی دوسری بیوی جناب امراؤ بیگم تھیں۔ وہ اپنے دونوں صاحبزادوں شمس الحق اور علاء الحق کے ساتھ محلہ بلی ماران بارہ دری شیر افگن میں مقیم تھیں۔ مولانا فضل حق اپنے عربی رسالے "الثورۃ الہندیہ" میں لکھتے ہیں:[2]

"اس وقت دہلی میں میرے اہل و عیال تھے اور مجھے کامیابی کی توقع تھی اور خیال تھا کہ (دہلی جانے سے) شادمانی اور مسرت حاصل ہو گی۔ لیکن غیب سے جو کچھ مقدّر ہو چکا تھا کسی کو کیا معلوم۔ الغرض میں نے دہلی جانے کی ٹھان لی، جہاں میرا مکان تھا اور روانہ

۱۔ مرقع الور (از محمد مخدوم تھانوی): ۱۵۵

۲۔ باغی ہندوستان: ۳۷۸

ہو گیا۔ یہاں پہنچ کے میں اپنے اہل وعیال سے ملا اور میں نے
لوگوں کو (ہنگامے سے متعلق) اپنی عقل وفہم کے مطابق مشورہ
دیا۔ لیکن نہ انھوں نے میرے مشورے پر عمل کیا نہ میرا کہا کیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب انگریزی فوجیں پوری قوت سے دہلی پر حملے کر رہی تھیں اور بد قسمتی سے دیسی سپاہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ان کا مشورہ قبول کرنے کا موقع ہی کون سا تھا؛ یہاں تو نفسا نفسی کا عالم تھا۔ انجام کار دیسی سپاہ کو شکست ہوئی اور انگریز ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کے گلی کوچوں میں دست بدست لڑائی ہوئی۔ اس کے بعد بھی ۱۹ ستمبر تک ہوتی رہی؛ لیکن تاب نہ لا سکے۔ آخر کار مقابلہ ختم ہوا اور شہر پر دوبارہ مکمل انگریزی قبضہ ہو گیا۔ مولانا نے اس زمانے کے حالات یوں قلمبند کیے ہیں:[1]

> "جب نصاریٰ (یعنی انگریزوں) کا شہر پر قبضہ ہو گیا، تو یہاں نہ دیسی فوج رہی، نہ کوئی شہری، نہ کھانے کو خوراک ملتی تھی، نہ پینے کو پانی۔ دشمنوں (یعنی انگریزوں) نے بھی ظلم وستم ڈھانا شروع کر دیے۔ میں پانچ دن رات تو شہر میں رکا رہا۔ پھر خدا پر بھروسہ کر کے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر، چل کھڑا ہوا۔ اور چونکہ بار برداری کا سامان مہیا نہ تھا، اس لیے سارا ساز وسامان اور کتابیں اور مال وغیرہ بھی یہیں چھوڑا۔

اگر ہم خیال کریں کہ وہ ۱۴ ستمبر کے بعد پانچ دن یہاں رہے تو گویا اہل وعیال کے

---

[1] باغی ہندوستان ۳۷۸-۳۷۹

ساتھ وہ ۱۹ ستمبر کو یہاں سے روانہ ہوئے اور اگر یہ ۱۹ سے گنا جائے تو یہاں سے روانہ ہونے کی تاریخ ۲۴ ستمبر ہوگی۔ عدالت کے سامنے بیان میں انھوں نے کہا ہے کہ میں دہلی میں صرف پندرہ دن رہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۴ یا ۹ ستمبر کے قریب یہاں پہنچے ہوں گے؛ حالانکہ منشی جیون لال کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۶ اگست کو دہلی میں موجود تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس دن وہ بہادر شاہ کے دربار میں شامل ہوئے اور انھوں نے نذر پیش کی[1]۔ عبداللطیف نے تاریخ ۱۹ اگست لکھی ہے، اگرچہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے یہاں پہنچ چکے تھے[2]۔

میرا اپنا خیال ہے کہ وہ عدالت میں انھوں نے جو کچھ کہا، یہ غالباً ٹھیک نہیں۔ اگر انھوں نے الور سے روانگی کی تاریخ صحیح بتائی ہے، تو الور اور دہلی کی مسافت اتنی نہیں کہ اس زمانے کے غیر معمولی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بھی، اسے طے کرنے میں چار ہفتے لگ گئے ہوں۔ وہ ضرور اس سے بہت پہلے یہاں آ گئے تھے۔

بہر حال وہ وسط اگست ۱۸۵۷ء میں یہاں پہنچے ہوں یا ستمبر کے شروع میں؛ جیسا کہ مولانا عرشی اپنے مشارٌ الیہ مضمون میں ثابت کر چکے ہیں، جس فتوے میں اُن کی شمولیت پر اصرار کیا جاتا ہے وہ ان کے آنے سے بہت پہلے جولائی ہی میں شائع ہو چکا تھا؛ اس پر ان کے دستخط کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

جب مولانا فضل حق اپنا بیان دے چکے، تو ان کی طرف سے مندرجہ ذیل پانچ صفائی کے گواہوں کی فہرست دی گئی:-

(۱) قادر بخش (۲) نبی بخش خیر آبادی (۳) علی محمد خان خیر آبادی؛ (۴) ممّو خان خیر آبادی (۵) احمد علی خان۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے بعض اصحاب نے کسی مصلحت سے کچھ

---

[1] غدر کی صبح شام: ۲۱۷ (مرتبہ خواجہ حسن نظامی، ہمدرد پریس دہلی۔ ۱۹۲۶ء)

[2] ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ: ۹۶ (از عبداللطیف۔ الجمعیۃ پریس دہلی۔ ۱۹۵۹ء)

ایسی باتیں کہیں، جن سے ملزم کو فائدہ تو درکنار، عین ممکن ہے کہ کچھ نقصان ہی پہنچا ہو۔
سب سے پہلے قادر بخش حاضر عدالت ہوا۔ اس نے کہا:

مولوی فضل حق خیر آباد کے رہنے والے ہیں۔ میں عدالتِ فوجداری پٹیالہ کا صدر تھا اور بغاوت شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلا آیا تھا۔ میں سیتا پور میں جلسہ ہونے سے دو ماہ پیشتر وہاں مقیم تھا۔ میری مولوی فضل حق سے کوئی رشتہ داری نہیں۔ یہ جب آخری مرتبہ خیر آباد واپس آئے ہیں، تو میں ان سے نہیں ملا تھا، بلکہ ان سے میری ملاقات ان کی واپسی کے کوئی سات مہینے بعد ہوئی، اور پھر سیتا پور کے جلسے کے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی۔ یہ بیگم (حضرت محل) کے آنے تک وہیں مقیم رہے تھے۔ بیگم کے جانے کے بیس دن کے بعد میں سیتا پور سے چلا آیا۔ مولوی فضل حق بھی خیر آباد سے چلے گئے، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئے تھے۔ وہ میرے چلے آنے کے بعد وہاں سے گئے۔ کوئی دو مہینے ہوئے، میں واپس خیر آباد آگیا۔ اس سے پندرہ بیس دن بعد مولوی فضلِ حق بھی وہاں آئے، مجھے معلوم نہیں کہ اس اثنا میں وہ کہاں رہے تھے۔

مجھے ان کے سابق حالات سے زیادہ واقفیت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سہارن پور میں سررشتہ دار تھے۔ لیکن کب، اس کا مجھے علم نہیں۔ یہ ٹامس مٹکاف کمشنر کے پاس بھی بطور سررشتہ دار ملازم رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ فضل الرحمٰن مہاراجہ پٹیالہ کے ملازم، ان مولوی فضل حق کے بڑے بھائی ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ مولوی فضل حق، بیگم (حضرت محل) کے ملازم تھے۔ ایک اور فضل حق سہارن پور کا رہنے والا تھا۔ وہ محمدی کا چکلہ دار تھا اور میں نے سنا ہے کہ وہ فیروز شاہ (ابن بہادر شاہ ظفر) کے ساتھ چلا گیا تھا۔

میں نے نہیں سنا کہ ان مولوی فضل حق نے کسی شخص کو گمراہ کر کے اسے بغاوت پر آمادہ کیا ہو۔

صفائی کے دوسرے گواہ نبی بخش خیر آبادی کا بیان حسب ذیل تھا:

میں مولوی فضل حق کو بچپن سے جانتا ہوں۔ ان کے والد مولوی فضل امام تھے وہ بھی دہلی میں انگریزی راج میں مفتی تھے۔ مولوی فضل حق بہت برس اپنے والد کے ساتھ دہلی میں رہے اور میں نے سنا ہے کہ یہ وہاں سرشتہ دار تھے اور سہارن پور میں بھی انگریزی ملازمت میں تھے۔ بغاوت سے پہلے یہ راجہ الور کے ملازم تھے۔ کوئی پندرہ مہینے ہوئے، جب یہ اپنے وطن خیر آباد آئے۔ یہ دو مہینے کے لگ بھگ یہاں رہے اور پھر میرے خیال میں لکھنؤ چلے گئے۔ جب انگریزوں نے لکھنؤ فتح کیا ہے، تو یہ واپس خیر آباد آئے اور دو تین مہینے یہاں رہے۔ میں نے پھر سنا کہ یہ ہرگاؤں گئے ہیں جو خیر آباد سے دس کوس شمال میں ہے۔ اس کے بعد میں نے انھیں آج سے ڈیڑھ مہینہ پہلے خیر آباد میں پھر دیکھا۔ میں نے نہیں سنا کہ یہ بریلی کے نواب (خان بہادر خان) یا بیگم (حضرت محل) کے ملازم رہے ہیں۔

ان کے دو بھائی زندہ ہیں۔ فضل الرحمٰن اور مظفر حسین۔ فضل الرحمٰن راجہ پٹیالہ کے ہاں ملازم ہے۔ مظفر حسین اجمیر میں فقیر (مجاور) ہے۔ میں نے نہیں سُنا کہ مولوی فضل حق نے کسی کو گمراہ کر کے اسے باغی بنایا ہو، یا خود انھوں نے خان بہادر خان کی ملازمت اختیار کر لی ہو۔

ہاں میں نے سُنا ہے کہ ایک اور فضل حق، شاہجہان پور کا رہنے والا تھا۔ وہ خان بہادر خان کا ملازم تھا اور فیروز شاہ کے ساتھ بھی گیا تھا۔

تیسرے صفائی کے گواہ علی محمد خان خیر آبادی تھے۔ انھوں نے یہ بیان دیا:

ڈھائی برس ہوئے جب مولوی فضل حق الور سے خیر آباد آئے، سیتا پور میں بغاوت کو دو برس ہوئے ہیں۔ مولوی فضل حق خیر آباد میں بغاوت کے بعد آئے تھے۔ اگرچہ میں ان دنوں رام پور میں تھا، لیکن ان کے یہاں آنے کے پندرہ روز بعد میں خیر آباد پہنچا۔ جب یہ رام پور سے گزرے ہیں، تو میں نے انھیں وہاں دیکھا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ چونکہ الور میں میری ملازمت جاتی رہی ہے، اس لیے میں واپس وطن جا رہا ہوں۔ میں یہاں دو مہینے گھر پر رہا۔ اس زمانے میں یہ خیر آباد ہی میں تھے۔ اس کے بعد کا مجھے علم نہیں۔ کیونکہ میں دربہ میں ملازم ہو گیا تھا۔ چھ مہینے بعد اہل و عیال کو لے جانے کے لیے میں دربہ سے خیر آباد آیا، تو انہی ایام میں مولوی فضل حق بھاگ کے ہرگاؤں چلے گئے۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

چوتھے گواہ ممتو خان خیر آبادی نے صرف اتنا کہا کہ:

کوئی سال بھر ہوا، مولوی فضل حق پٹیالے سے خیر آباد آئے،
جہاں وہ راجہ کے ملازم تھے۔ سیتا پور میں بغاوت ان کے آنے
کے بعد ہوئی۔ ایک سال پہلے جب بیگم (حضرت محل) یہاں سے
گئی ہے، تو مولوی فضل حق بھی خیر آباد سے بھاگ گئے۔

آخری گواہ احمد علی تھے۔ انھوں نے بس اتنا کہا کہ:

میں نے سات مہینے ہوئے مولوی فضل کو بونڈی میں دیکھا تھا۔
میں وہاں پانچ دن رہا۔ اس سے زیادہ کا مجھے علم نہیں۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ان صفائی کے گواہوں کے بیان بھی آپس میں متفق نہیں۔ مثلاً:
نبی بخش خاں کہتے ہیں کہ مولانا فضل حق کو خیر آباد آئے پندرہ مہینے ہوتے ہیں۔ علی محمد خاں یہ واقعہ ڈھائی برس پہلے کا بتاتے ہیں اور ممتو خان کوئی سال بھر کا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں عدالت ان میں سے کسی پر بھی اعتماد نہیں کر سکتی۔

بہر حال ان پانچوں گواہوں میں سے پہلے دو یعنی قادر بخش اور نبی بخش کے بیان بہت حد تک ان کے حق میں تھے۔ خاص طور پر نبی بخش نے جملہ واقعات کسی ایچ پیچ کے بغیر پوری صراحت اور جرأت سے بیان کیے ہیں۔ علی محمد خان کے بیان میں اگرچہ کوئی خاص بات مولانا موصوف کے خلاف نہیں تھی۔ لیکن اس کے ہاں ایک اہم مسئلہ کے متعلق تضاد ہے۔ اس نے کہا کہ انھیں خیر آباد واپس آئے ڈھائی برس ہوتے ہیں اور یہ خیر آباد اور سیتا پور میں بغاوت شروع ہونے کے بعد یہاں آئے تھے۔ اتنی بات تو ان کے حق میں تھی۔ کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ان کا شورش میں کوئی ہاتھ نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن اگلے سوال کے جواب میں اس نے کہہ دیا کہ وہاں بغاوت ہوئے دو برس ہوتے ہیں، گویا یہ ان کے وہاں پہنچنے کے بعد ہوئی۔ یہی بات

اس گواہ کے بعد ممّوخاں خیر آبادی نے بھی کہی۔ اس نے تصدیق کی کہ "سیتا پور میں بغاوت ان کے آنے کے بعد ہوئی۔" آخری دونوں بیان سب سے کمزور بلکہ بے کار ہیں، اور چونکہ یہ صفائی کے گواہوں کے ہیں جن کی فہرست ملزم کی پیش کردہ تھی، اس لیے ظاہر ہے کہ عدالت پر اس کا اثر مخالفانہ ہی ہو سکتا ہے۔

(۳)

کپتان تھربرن نے استغاثہ اور ملزم اور صفائی کے گواہوں کے بیانات لینے کے بعد ۲۸ فروری ۱۸۵۹ء کو مندرجہ ذیل فردِ جرم مرتب کی اور مقدمہ جوڈیشل کمشنر اودھ کی عدالت میں منتقل کر دیا۔

فردِ جرم

(۱) ملزم (مولوی) فضل حق نے مئی ۱۸۵۸ء میں بوندی کے مقام پر باغی سرغنہ ممّوں خان کے مشوروں میں نمایاں حصہ لیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود باغیوں کا سردار تھا اور لوگوں کو بغاوت پر اکساتا رہا۔

۲) مئی ۱۸۵۸ء میں بوندی کے مقام پر وہ لوگوں کو قتل پر اکساتا رہا۔ مثلاً اس نے باغی سرغنہ ممّو خان کو ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کے قتل کا مشورہ دیا۔

تشریح

فروری ۱۸۵۸ء میں باغیوں نے ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو گرفتار کر لیا اور اسے بیگم اور ممّو خان کے پاس لے گئے، جو ان

دنوں قلعہ بوندی کے اندر اور اس کے گرد و نواح میں پڑاؤ ڈالے تھے۔ عبدالحکیم کے ساتھ ہی ایک اور شخص مرتضیٰ حسین بھی گرفتار ہوا تھا۔ جو اگرچہ سرکاری ملازم تو نہیں تھا لیکن چونکہ وہ انگریزوں کا خیر خواہ تھا، اس لیے باغیوں کی آنکھ میں کھٹکتا تھا۔ جب یہ دونوں شخص ممو خاں کے سامنے پیش ہوئے تو ملزم نے جو وہاں موجود تھا قرآن کی آیتیں پڑھیں اور یہ رائے ظاہر کی کہ یہ دونوں موت کے سزاوار ہیں۔ شہادت سے ثابت ہے کہ فضل حق ملزم کا ممو خان پر بہت اثر تھا؛ یہ اس کے مشیر تھے اور اس حیثیت سے باغی فوج میں گویا سرغنہ تھے۔ انھوں نے ممو خان پر اپنے اثر و رسوخ کو عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین کے خلاف استعمال کیا۔

اگرچہ ان دونوں نے بعد کو قید سے رہائی حاصل کر لی، لیکن یہ فضل حق کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ہوئی۔ یعنی جب باغی سرغنے (ممو خان) نے انھیں مولوی احمد اللہ شاہ کی جائیداد ضبط کرنے کو بھیج دیا تھا۔

اس پر مقدمہ کے جملہ کوائف، گواہوں کے بیانات اور کپتان ہتھربرن کی تحریر کردہ فردِ جرم جوڈیشنل کمشنر (اودھ) مسٹر جارج کیمبل (G. CAMPBELL) اور میجر بارو (BARROW) قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت میں پیش ہوئی۔ انھوں نے ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو فیصلہ صادر کیا:

مولوی فضلِ حق پر الزام یہ تھا:

الزام: بغاوت اور قتل پر انگیخت

تشریح: (۱) وہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے دوران میں بغاوت کا سرغنہ رہا،

اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو
بغاوت اور قتل کی ترغیب دی۔

تشریح: (۲) اس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سرغنے ممّوخان
کی مجلسِ مشاورت میں نمایاں حصّہ لیا۔

تشریح (۳): اس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں ایک سرکاری
ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی۔

ملزم نے جرم سے انکار کیا اور سماعت شروع ہوئی۔

عدالت کے سامنے ملزم مندرجہ ذیل امور میں مجرم ثابت ہوا۔

(۱) ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں اس نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔

(۲) ۱۸۵۸ء میں بوندی کے مقام پر اس نے باغیوں کے، جو وہاں
پڑاؤ ڈالے جمع تھے اور بالخصوص باغی سرغنے ممّوخان کے مشوروں
میں خاص سرگرمی دکھائی۔ ان ہی ایام میں اس نے ایسے فتوے دیے
جن کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔

۴/ مارچ ۱۸۵۹ء کو اسے بطور شاہی قیدی حبسِ حیات جبس بعبور
دریائے شور اور اس کی تمام جائیداد کی ضبطی کی سزا دی گئی۔

نقل فیصلہ

ملزم کے مقدمہ کے دو پہلو ہیں۔ یہ تو معلوم ہی تھا کہ وہ ۱۸۵۸ء
میں اودھ کے باغی سرغنوں کا خاص مشیر تھا لیکن اس کی گرفتاری
کے بعد دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث وہاں
کے حکام نے بھی اس سے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر

دہلی نے اس کے جو حالات تحریر کیے، ان سے معلوم ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہٖ اسی قسم کی تھیں۔ لیکن جہاں تک قیام دہلی کے زمانے میں اس کے چال چلن کا تعلق ہے، وہاں کے گواہ عدالت کے سامنے نہیں، نہ ملزم کو ان گواہوں پر جرح کرنے اور عائد کردہ الزامات کی جوابدہی کا موقع دیا گیا ہے البتہ جہاں تک اودھ کا تعلق ہے اگر یہ مقدمہ ثابت ہو جائے تو پھر ملزم کے عام چال چلن اور رویے کے لیے دہلی کی شہادت بھی تائیدی اور توثیقی حیثیت سے تسلیم کی جا سکتی ہے۔

اس پر الزام یہ لگائے گئے ہیں:

اوّل: پوری بغاوت کے دوران میں بالعموم لوگوں کا بھڑکانا؛ اور

دوم: ۱۸۵۸ء میں بالخصوص اودھ میں بغاوت پر اُکسانا۔

اس امر کی قوی شہادت موجود ہے کہ ایک موقع پر اس نے قتل کی شہہ دی، جو براہ راست قتل کے مترادف تھی۔ لیکن چونکہ جن اشخاص کے قتل کی کوشش کی گئی تھی، وہ واقعی قتل نہیں کیے گئے تھے، اس لیے عدالت نے ملزم کے خلاف یہ جرم تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس بات کا بھی یقین نہیں کہ انجام کار ملزم نے ان اشخاص کی رہائی کے لیے بھی اپنی رضامندی کا اظہار نہ کر دیا ہو۔

بہر حال عدالت کی نظر میں یہ ثابت ہے کہ اس موقع پر ملزم نے بلاضرورت مستعدی دکھاتے ہوئے صراحت سے ایسا فتویٰ دیا، جس کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔ اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے

ملازم کافر اور مرتد ہیں؛ اور اس لیے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے۔ بلکہ اس نے باغی سردار سے یہاں تک کہا کہ اگر تم انھیں قتل نہیں کرتے، تو خود خدا کی نظر میں مجرم ہو۔ ہم نے اس شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا ہے کہ ممکن ہے اس نے اس خاص موقع پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان سے اس کا مقصد یہ ہو کہ یہ اشخاص انگریزی ملازمت ترک کر کے باغیوں کے ساتھ مل جائیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ایسے معتقدات (فتووں) کا اصلی مقصد قتل کی ترغیب دینا ہے، جس کی متعدد مثالیں اس بغاوت کے دوران میں ملتی ہیں۔

دہلی میں بھی اس کا یہی کام تھا اور اودھ میں بھی اس نے اپنی یہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اس نے مقدمے کے دوران میں ایک موقع پر یہ صفائی پیش کی تھی کہ اودھ میں دو مشہور فضل حق ہیں۔ لیکن یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ وہ دوسرا شخص سابق میں ضلع بریلی کا تحصیلدار تھا اور پچھلے ایام میں چکلہ دار اور باغیوں کا سرغنہ رہا ہے لیکن ملزم تو کبھی صاحبِ سیف رہا ہی نہیں، بلکہ اس کی ہمیشہ صاحب رائے و مشورہ کی حیثیت سے شہرت رہی ہے اور وہ بوندی کے مقام پر باغیوں کی مجلسِ شوریٰ (پریوی کونسل) کا اہم رکن تھا۔ یہ بات مشکوک ہے کہ آیا ملزم کسی باقاعدہ عہدے پر فائز تھا؛ یا اس مجلسِ شوریٰ کی کوئی رسمی حیثیت بھی تھی یا نہیں، لیکن اس سے متعلق تو کوئی شبہ نہیں اور یہ بات ان ایام میں خاص طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیرانِ خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی "اربعہ شوریٰ" کے نام سے شہرت تھی، بلکہ کبھی کبھی انھیں "در کچہری

پارلیمنٹ" کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں ملزم بہت ممتاز تھا۔

یہ بات بھی قطعی شہادتوں سے ثابت ہو گئی ہے کہ ملزم سردار ممو خان کا خاص معتمد علیہ تھا۔ اور وہ اکثر ان سے مشورہ کرتا رہتا تھا، جیسا کہ اس موقع پر بھی ہوا۔ جب اس نے قتل کا فتویٰ دیا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے لیکن جس طرح اوپر بیان ہوا، اس نے بہیمانہ ہوس یا مذہبی تعصب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور ان کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لیے انصاف اور امن عامہ کا یہ تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔

وہ اودھ کا باشندہ ہے، اور ایک ایسے خاندان کا فرد ہے جو انگریزی حکومت کا ساختہ پرداختہ ہے۔ بلکہ ایک زمانے میں وہ خود بھی سرکاری ملازمت میں اچھے بڑے عہدے پر متمکن تھا۔ لیکن گذشتہ کئی برس سے وہ انگریزی ملازمت ترک کر کے اودھ، رام پور، الور وغیرہ متعدد دیسی ریاستوں میں معقول عہدوں پر ممتاز رہا ہے۔ اس کی ہمیشہ بہت شہرت رہی ہے۔ جن گواہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ بھی مولوی فضل حق کا نام اکثر سنتے آئے تھے۔ بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دیدہ و دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان

سے خارج کر دینا چاہیے۔

ملزم کے بڑھاپے اور سماج میں اس کی نمایاں حیثیت اور اودھ کا باشندہ ہونے اور اس کے سرکار انگریزی کا نہیں، بلکہ گذشتہ کئی برس سے دیسی ریاستوں کا ملازم ہونے کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ اس سے عام قیدی کی جگہ سیاسی قیدی کا سا سلوک کیا جائے۔

(۴)

چونکہ فوجی عدالت کے فیصلوں سے متعلق یہ قاعدہ ہے کہ ان کے خلاف مرافعہ (اپیل) نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ بالعموم تصدیق کے لیے حکام بالا کے پاس بھیج دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ جوڈیشنل کمشنر کی عدالت سے مولانا فضلِ حق کے مقدمے میں جو فیصلہ ہوا تھا، اسے بھی تصدیق کے لیے گورنر جنرل با اجلاسِ کونسل کی خدمت میں کلکتے بھیج دیا گیا۔ جب مولانا کو معلوم ہوا کہ ابھی امید ہے کہ شاید اس میں تبدیلی کرائی جا سکے۔ تو انھوں نے اپنے وکلا مسرز سوِن ہو، بیلی اینڈ لیزلی Swinhoe Beely Leslie کی وساطت سے گورنر جنرل کی خدمت میں یہ التماس کی کہ میرے ساتھ انصاف نہیں ہوا اور جوڈیشنل کمشنر کا فیصلہ رد کیا جائے۔ جب اس پر جواب ملا کہ کمشنر کے فیصلے کی تصدیق کر دی گئی ہے تو انھوں نے پھر حسبِ ذیل درخواست پیش کی۔[۱]

درخواست بحضور جناب ارل کیننگ۔ جی۔ سی۔ پی وائسرائے و گورنر جنرل با اجلاسِ کونسل

میرے خلاف جو مقدمہ چلایا گیا ہے اور اس میں جو فیصلہ

---

[۱]۔ قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دہلی National Archives of India
(فارن پولیٹیکل، ستمبر ۱۸۶۰ء (۵۵۷)

ہوا ہے اور جو سزا مجھے دی گئی ہے، یہ حضور ملکۂ معظمہ کے عام معافی کے اعلان کے خلاف ہے۔

۱۔ مجھ پر "بغاوت اور قتل کی ترغیب" کا الزام لگایا گیا ہے۔ لیکن شاہی اعلان نے یہ تمام جرم معاف کر دیے ہیں۔ اس لیے اگر بفرضِ محال یہ خیال بھی کر لیا جائے کہ یہ قیدی ان جرائم کا مرتکب ہوا تھا، جب بھی اس اعلانِ شاہی کی موجودگی میں مجھ پر جو مقدمہ چلایا گیا ہے اور جو سزا دی گئی ہے، یہ خلافِ قانون ہے۔ اعلان نے عام معافی سے صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا ہے جنھوں نے براہِ راست برطانوی رعایا کے قتل میں حصہ لیا یا قاتلوں کو پناہ دی۔ یا وہ لوگ جو بغاوت کے سرغنہ تھے یا جنھوں نے لوگوں کو بغاوت پر اُکسایا، میں ان میں سے کسی جُرم کا بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ مرتکب نہیں ہوا۔

۲۔ میرے خلاف پہلا الزام یہ ہے کہ میں باغیوں کا سرغنہ تھا اور میں نے انھیں بغاوت کی ترغیب دی۔ لیکن سپیشل کمشنر نے جو فیصلہ صادر کیا ہے، اسی سے اس الزام کی تغلیط ہو سکتی ہے اس میں انھوں نے متضاد باتیں بیان کی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ملزم (یعنی میں) باغیوں کا مشیر کار اور بغاوت کا سرگرم ترغیب دینے والا تھا۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ جب بغاوت شروع ہوئی تو ملزم الور میں ملازم تھا؛ لیکن بعد کو وہ خود بخود دہلی آیا، اور اس کے بعد وہ باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا۔ مشیر کو بغاوت کی ترغیب دینے والا کہنا، لفظوں کو

کو غلط معنی پہنانا ہے، اور جو شخص محض باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا ہے، اسے ترغیب دینے والا کہنا علت و معلول کو بالعکس کر دینے کے مرادف ہے۔

۳۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سپیشل کمشنر نے بیان کیا، میں ریاست الور میں ملازم تھا اور دہلی میں بغاوت شروع ہونے کے چار مہینے بعد اپنی بیوی کو وہاں سے نکالنے کے لیے آیا۔ میں بیوی کو ساتھ لے کر اپنے وطن خیرآباد چلا گیا اور مئی ۱۸۵۸ء میں احمد اللہ کے ظلم و ستم سے جان بچانے کی خاطر بھاگ کر بوندی گیا۔ اس کے بعد مسیح الزماں نے مجھے پکڑ کر قید کر دیا، کیونکہ میں نے اس کے ساتھ بغاوت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اب حالت یہ ہے کہ مسیح الزماں جو باغیوں کا سرغنہ تھا وہ تو آزاد دندناتا پھر رہا ہے اور میں، جس کا جرم صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ میں نے باغیوں کو مشورہ دیا، باوجودیکہ خود بعض باغیوں نے مجھ پر ظلم توڑے تھے۔ مجھے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی ہے۔

۴۔ سزا کے خلاف قانون ہونے کا ثبوت خود اسی فیصلے میں موجود ہے، جو سپیشل کمشنر نے میرے مقدمہ میں دیا ہے لکھا ہے:

"یہ بہت ہی خطرناک آدمی ہے اور کسی وقت بھی انتہائی نقصان پہنچا سکتا ہے اس لیے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے، اس سے ظاہر ہے کہ فدوی کو سزا اس لیے نہیں دی گئی کہ میں نے کوئی جرم کیا ہے، بلکہ مجھے

ملک بدر اس لیے کرنا چاہیے تاکہ میں کبھی نقصان پہنچانے کے قابل نہ رہوں۔ اگرچہ سمجھنا محال ہے کہ میرے جیسا پیرانہ سال شخص نقصان ہی کون سا پہنچا سکتا ہے۔ سپیشل کمشنر اس لیے مقرر ہوئے تھے کہ وہ ان لوگوں کے مقدمات کی سماعت کریں، جن کے جرائم ملکۂ معظمہ کے اعلانِ معافی سے مستثنیٰ کیے گئے تھے۔ فدوی کسی ایسے جرم کا مرتکب نہیں ہوا اگرچہ سپیشل کمشنر دلی نے مجھے سزا اس جرم کی دی ہے کہ میں نے لوگوں کو بغاوت کی ترغیب دی تھی لیکن خود ان کی اپنی رائے یہ بھی ہے کہ میں باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا یا زیادہ سے زیادہ میرا جرم صرف اتنا ہے کہ میں نے بعض سرغنوں کو مشورہ اور صلاح دی جو اعلانِ شاہی کے مطابق بہت خفیف جرم ہے لیکن میں نے اُن کے فیصلے سے جو فقرے نقل کیے ہیں، اُن سے اُن کا اصلی مدّعا واضح ہو جاتا ہے یعنی وہ مجھے ملک سے باہر اس لیے بھیجنا چاہتے ہیں کہ میرا چال چلن ٹھیک رکھنے کی یہی ایک ضمانت ہے۔

۵۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ مقدمہ اس کی کارروائی اور اس میں جو سزا دی گئی ہے، یہ سب کچھ ملکۂ معظمہ کے اعلان کے خلاف ملکہ قانون اور انصاف ہی کے خلاف تھا، تو کیا حضورِ والا اس کی حمایت کریں گے؟ اور یہ کس لیے؟ تاکہ ایک مسن شخص اپنے خاندان سے دور مرنے کو بھیج دیا جائے؛ اور اس کے خاندان کو اس آذوقہ سے محروم کر دیا جائے جو ان کی زیست کا سہارا ہے۔

۶۔ جب میں نے میسرز سوان ہوا، بلیی اینڈ لیزلی کی وساطت سے
درخواست پیش کی، تو مجھے مطلع کیا گیا کہ میرے مقدمے پر
باجلاسِ کونسل غور کرنے کے بعد سپیشل کمشنروں کے فیصلے
کی تصدیق کر دی گئی ہے اگرچہ جو سرکاری جواب مجھے ملا ہے
اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تاہم مجھے یقین ہے کہ سپیشل کمشنروں
کے فیصلے کا بہت غور اور توجّہ سے مطالعہ کیا گیا ہوگا۔ بہر حال
اس سے ایک بات تو واضح ہے کہ جب ان کے فیصلے کی تصدیق
میری درخواست موصول ہونے سے پہلے ہی کر دی گئی تھی،
تو اس میں جو دلائل میں نے پیش کیے تھے، ظاہر ہے کہ ان
پر غور نہیں کیا گیا۔

اس لیے اب میری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ صدر میں
اسپیشل کمشنروں کے فیصلے کے خلاف قانون ہونے سے
متعلق لکھا گیا ہے، اس پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے اس
کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ شاہی اعلان کے مطابق، انصاف کیا جائے
یا ایک پیرانہ سال بوڑھے اور اس کے متعدد بے بس افراد
خاندان پر رحم کو مدِّنظر رکھا جائے؛ بہر حال میری رہائی اور مختصر
جائیداد کی بحالی کے احکام صادر فرمائے جائیں گے۔

اس دوسری درخواست سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا اور سزا بحال رہی، البتہ گورنر جنرل نے،
معلوم ہوتا ہے، یہ حکم صادر کیا کہ ان سے مشقت نہ لی جائے، نہ ان کے بڑھاپے کو
پیش نظر رکھتے ہوئے ان سے کسی طرح کی سختی کا سلوک کیا جائے۔ اس پر جوڈیشل کمشنر
نے مئی ۱۸۵۹ء میں ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کو ہدایت دی کہ اب اس سزا کا حکم نافذ کر دیا جائے

چنانچہ اس کی تعمیل میں انھیں کالے پانی (جزیرۂ انڈمان) بھیجنے کے لیے لکھنؤ سے کلکتہ منتقل کیا گیا۔ ان ایام کی کہانی خود مولانا کی زبانی سنیے۔ اپنے عربی نثری رسالے "ثورۃ الہندیہ" میں لکھتے ہیں :[1]

"جب نصاریٰ نے مجھے دھوکے اور فریب سے قید کر کے ابتلاء میں مبتلا کیا تو پہلے ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے کو اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین کو منتقل کرتے رہے۔ انھوں نے مجھے الم پر الم اور غم پر غم پہنچائے۔ میرے جوتے اور لباس اتروا لیا اور ان کی جگہ موٹے جھوٹے اور کھردرے کپڑے پہنا دیے۔ مجھ سے نرم اور آرام دہ بستر چھین لیا اور اس کی جگہ تکلیف دہ اور سخت بستر دے دیا، جو گویا کانٹوں کا بچھونا یا انگاروں کا بستر تھا۔ انھوں نے میرے پاس لوٹا، پیالا یا کوئی اور برتن نہیں چھوڑا۔ وہ مجھے کھانے کو اڑد کی دال اور پینے کو گرم پانی دیتے تھے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں براہِ راست کلکتہ نہیں لے گئے تھے بلکہ مختلف جیلوں میں رکھتے ہوئے آخر کار کلکتہ پہنچایا گیا تھا۔

(۵)

غالب کے مولانا فضلِ حق سے ہمیشہ دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات رہے تھے۔ ان کے فارسی نظم و نثر کے مجموعوں میں اس کے متعدد ثبوت موجود ہیں۔ جس زمانے میں مولانا زیرِ حراست کلکتہ پہنچے ہیں، مرزا کے ایک اور مصیبت زدہ عزیز دوست

---

[1] باغی ہندوستان : ۴۲۰-۴۲۱

ناظر حسین مرزا اور ان کے بھانجے یوسف مرزا بھی کلکتے میں موجود تھے۔ یوسف مرزا نے غالب کو ان کے حال کی اطلاع دی ہوگی۔ اس پر مرزا غالب نے یوسف مرزا کو لکھا:[1]

مولانا (فضل حق) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا؛ کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا، بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے، اجر ہونا تھا، سو ہو لیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

مرزا کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً مولانا فضلِ حق کے فرزندِ اکبر مولانا عبدالحق نے گورنر جنرل باجلاسِ کونسل کے فیصلے کے خلاف وزیرِ ہند کی خدمت میں مرافعہ پیش کیا تھا یا کرنے والے تھے۔ لیکن بہر حال ظاہر ہے کہ اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

جب تک انڈیمان کے لیے جہاز کا انتظام نہیں ہو سکا مولانا کو یہاں کلکتے میں علی پور جیل میں رکھا گیا تھا۔ جب شہر کے معززین کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے طور پر مندرجہ ذیل درخواست تیار کر کے حکومت کی خدمت میں روانہ کی:[2]

"بحضور رائٹ آنریبل گورنر جنرل ہند باجلاسِ کونسل، کلکتہ اور اس کے مضافات اور اضلاع کے دستخط کنندگان کی درخواست۔

ہم درخواست کنندگان نہایت ادب سے یہ کہنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ مولانا فضلِ حق (الور کے رہنے والے) جنھیں سپیشل کمشنر اودھ نے سزا دی ہے اور جو حبسِ دوام بعبورِ شور کے قیدی کی حیثیت سے

---

[1] اردوئے معلیٰ: ۲۴۹ (کریمی پریس لاہور ۱۹۲۲ء)

[2] قومی دفتر خانہ ہند، نئی دہلی۔ فارن، پولیٹیکل، ستمبر ۱۸۶۰ء نمبر ۵۵۸

علی پور قید خانے میں لائے گئے ہیں، محض بے گناہ آدمی ہیں اور ہم ان کے صحیح حالات بیان کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کی سخت سزا انھیں دی گئی ہے، وہ کسی طرح اس کے مستحق نہیں کیونکہ وہ نہ تو قاتل ہیں نہ باغی، نہ انھوں نے لوگوں کو بغاوت پر بھڑکایا، نہ انھیں اپنے ہاں پناہ دی، نہ ان کی ملازمت میں رہے۔ اودھ کے حکام نے بھی ان میں سے کوئی الزام ان پر نہیں لگایا، نہ کوئی ایسی بات ہی وہ ان کے خلاف ثابت کر سکے ہیں۔ نہ صرف یہ، بلکہ وہ تو یہ بھی ثابت نہیں کر سکے کہ یہ وہی فضل حق ہیں، جو اس سے پہلے تحصیلدار رہا تھا؛ اور بغاوت کے آغاز کے زمانے میں چکلہ دار تھا۔ اس کے بالعکس یہ پوری طرح ثابت ہو گیا ہے کہ ان مولانا فضل حق کا بلا واسطہ یا بالواسطہ، بغاوت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ الور میں تھے، اور شورش کے شروع ہونے کے چار مہینے بعد اپنے اہل و عیال کو دلی سے ساتھ لے کر اپنے وطن خیر آباد چلے گئے؛ اور جب تک انگریزی تسلط اودھ پر دوبارہ قائم نہیں ہو گیا اور باغی وہاں سے فرار نہیں ہو گئے، یہ وہیں مقیم رہے؛ اور جب خیر آباد کے متعدد باشندے اپنی جان اور ناموس کو بچانے کی خاطر وہاں سے بھاگے تو مولانا فضل حق نے بھی ان کا تتبع کیا۔ جب شاہی اعلان کے ذریعے عام معافی کا اعلان ہوا اور لوگ مقررہ میعاد کے اندر حاضر ہونے لگے، تو وہ بھی فوجی افسر اعلیٰ کے سامنے پیش ہوئے اور اس کی اجازت سے اپنے مکان پر رہنے لگے۔ اس کے بعد انھیں یہاں سے گرفتار کیا گیا اور

اگرچہ ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا ، اس کے باوجود محض شبہات کی بنا پر انھیں ایسی سخت سزا دی گئی ہے۔
اس سزا کی ایک اور وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ حکام کی نظروں میں وہ بہت ذہین اور قابل شخص ہیں۔ ہم حضورِ والا کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ کبیر السّن ہیں۔ ستر برس کے لگ بھگ ؛ اور اگرچہ وہ بیشک بہت قابل شخص ہیں لیکن ان کی ساری قابلیت صرف ایک بات یعنی علوم شرعیہ کی تعلیم میں محدود ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ واقعی عقلمند اور قابل ہیں، تو یہ عقل سے قطعی بعید ہے کہ کوئی شخص حکام وقت کے خلاف کھڑا ہو جائے، جن کی طاقت اور تسلط یقینی اور مسلّمہ ہے۔ وہ نہ صرف بوڑھے اور کمزور ہیں بلکہ وہ اکثر مختلف بیماریوں کا شکار رہتے ہیں اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی مرض ان کے لاحق رہا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ کسی خطرناک اقدام کے لیے انھیں فرصت ہی کب ملی ہو گی۔ ۱

ہم درخواست کنندگان کی نہ قیدی سے کوئی رشتہ داری ہے نہ تعلق! گو ہم میں سے بعض یا ان کے شاگرد ہیں، یا ان کے شاگردوں کے شاگرد۔ لیکن چونکہ بے شبہہ وہ قابلِ احترام اور بے گناہ شخص ہیں۔ اور ان کا ان الزامات سے کوئی واسطہ نہیں جو ان کے خلاف عائد کیے گئے ہیں، اس لیے ہم حضورِ والا کی خدمت میں یہ التماس کرتے ہیں کہ یا تو انھیں رہا کر دیا جائے جس کے وہ ہر طرح مستحق ہیں؛ یا انھیں بنگال کے کسی ضلع ہی میں قید کر دیا جائے؛ یا پھر مکّہ کو

ہجرت یا حج کی اجازت مرحمت ہو۔

(دستخط) مولوی فضل الرحمن قاضی القضاۃ کلکتہ

حاجی محمد صدیق از عمائد کلکتہ

عبدالوحید تاجر

(اس طرح ڈیڑھ سو اصحاب کے دستخط ہیں۔)

لیکن افسوس کہ یہ سعی بھی رائیگاں گئی اور حکومت نے اپنا فیصلہ بدلنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار انھیں کلکتے سے فایر کوین (۶) Fire Queen نامی جہاز پر سوار کر کے سمندر پار انڈیمان بھیج دیا گیا، جہاں اس زمانے میں تمام عمر قیدی بھیجے جاتے تھے۔ ان کا جہاز ۸ / اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیر پہنچا۔ یہاں ان کا قیدیوں میں نمبر (۳۶۸۷) تھا۔

انڈیمان کی آب و ہوا اور حالت جیسی کچھ ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اگر یہ آج اتنی خراب ہے تو آج سے سوا سو سال پہلے جو حال ہوگا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مولانا فضل حق کو اپنے اہل و عیال سے مفارقت کا خیال ہونا ہی چاہیے تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ وہ بے گناہ سزایاب ہوئے تھے۔ وہ ناز و نعم میں پلے تھے۔ ساری عمر اچھے اچھے عہدوں پر باعزت بسر کی تھی۔ اب یہاں موٹا جھوٹا کھانا اور موٹا جھوٹا پہننا پڑا۔ یہ انقلاب روزگار انھیں کیوں شاق نہ گزرتا۔!

یہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنی سرگزشت عربی نظم و نثر میں قلمبند کرنا شروع کی۔ اسے انھوں نے فروری ۱۸۶۰ء میں مکمل کیا اور پھر ان تحریروں کو کسی طرح اپنے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس بھیج دیا۔ ان میں ایک قصیدۂ ہمزیہ ہے؛ اس میں انھوں نے جزیرہ کی آب و ہوا اور زندگی کی کیفیت اور اپنے حزن و ملال کا تفصیلی حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے [۷] (حاشیہ صفحہ ہذا آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مجھ پر ظلم ہوا ہے کہ مجھے اچانک میرے اہل و عیال اور وطن سے دُور پھینک دیا گیا ہے، حال آنکہ میری اولاد ابھی کمزور اور کمسن ہے۔ وہ بھی ظلم سے اپنے گھر سے نکال دیے گئے ہیں، اب ان کے پاس نہ سکونت کی جگہ ہے نہ سکینت کا ٹھکانا۔ وہ فقیر و قلّاش بن گئے ہیں کیونکہ ان کے پاس نہ مکان ہے نہ روزی، نہ کوئی اور شئے۔ میں ان سے جدا ہوا ہوں تو وہ قانون کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کے پاس نہ کوئی ساز و سامان تھا، نہ مال و دولت، عزیز و اقرباء نے بیگانوں کی طرح ان سے پہلو تہی کی؛ اور ان کے برابر کے ملنے والوں نے ان پر ظلم کیا۔ اب قید و بند میرے اور میرے خاندان اور اقارب کے درمیان حائل ہے۔ اب یہاں دوست کی جگہ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ اب نہ میرے احوال کی خبر میری اولاد تک پہنچ سکتی ہے، نہ اُن کی خبر مجھے۔ میں اقارب و احباب کی جدائی پر نالاں و گریاں ہوں؛ اور اُن کی قسمت میں بھی میری جدائی میں نالہ و بکا کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اگر میرے لیے آنسو بہائیں تو جائز ہے کیونکہ موت اور ذلیل قید خانے میں زندگی کے دن گزارنا ایک برابر ہے۔ مجھے اس بیابان جنگل میں لا کے رکھ دیا ہے، جہاں دو وحشیوں، کوّوں اور اجنبیوں کے سوائے اور کوئی شئے نظر نہیں آتی۔ یہاں کی آب و ہوا ناخوشگوار اور وبائی ہے۔ کھانا ایسا ہے کہ اس سے طبیعت سیر نہیں ہوتی اور

لہ (حاشیہ صفحہ سابقہ)، باغی ہندوستان: ۴۴۴ - ۴۴۵

پانی ایسا کہ اس سے پیاس نہیں بجھتی۔ پانی ملتا ہے تو گرم، جس سے طبیعت میں طراوت پیدا نہیں ہوتی، کھانا ہے تو ارہر کی دال، جس میں ذائقہ نہیں۔

غرض یہاں میٹھا پانی ہے، نہ لذیذ کھانا، نہ کھلی فضا۔ اور میری مصیبت میں میرے جسمانی عوارض، فتق اور قولنج اور داد نے اور اضافہ کر دیا ہے۔

مجھے راحت و عافیت کے فقدان کا رنج تو ہے ہی، لیکن ان مصائب نے اور یہاں کی ناخوشگوار آب و ہوا نے تو گویا مجھے ختم ہی کر دیا۔

اسی طرح اپنی گزشتہ خوش بختیوں اور عیش و عشرت کی زندگی کو یاد کر کر کے روتے ہیں اور آخر میں دعا کرتے ہیں[1]

اے میرے خدا! میری اُمید بر لا اور مجھے دشمنوں کے پنجے سے نجات دلانے میں تاخیر نہ فرما۔

میں سست گاموں کو بڑھانے میں کوشاں رہا لیکن افسوس کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو خود اس میں بڑھ کے حصہ لینے کی جگہ پیچھے بیٹھ رہا۔ میں نے اس موقع پر کمزوری دکھا کے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔ خوش قسمت لوگ شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گئے لیکن میں اس سے محروم رہا۔

خدایا! میرے کیے کو معاف کر دے، مجھے بخش دے! مجھے تجھ سے

---

[1] باغی ہندوستان: ۴۵۵ - ۴۵۷

عفو و درگذر ہی کی توقع ہے ۔
بے شک میرے گناہ بہت ہیں، لیکن تیری رحمت بھی تو اتنی وسیع ہے کہ اس کی حد ہے نہ انتہا۔
پس مجھے بخش دے اور معاف فرما؛ اور دشمنوں اور تہمت لگانے والوں نے مجھے جس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے، اس سے نجات دے،
اور اگر یہ مصیبت، جس کی میں شکایت کر رہا ہوں، تیری طرف سے مقدر ہے، جب بھی تو مظلوم کی دعا سے تو اسے ٹال سکتا ہے ۔
مظلوم تجھے نہ پکارے تو اور کیا کرے۔ تو اس کی حس سے انکار نے اس پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں ۔
ان کی مسلسل سختیوں اور تہمتوں اور رسوائیوں نے میری جان عذاب میں کر دی ہے ۔

غرض اسی طرح کی زار نالیوں سے خداوند تعالیٰ سے رحم کی دعائیں کرتے ہیں کہ کسی طرح اس جلاوطنی سے رہائی اور مخلصی نصیب ہو

(۷)

وہ یہاں کالے پانی پہنچنے کے بعد بھی ہمت نہیں ہارے، اور انھوں نے ایک اور کوشش حکام سے داد رسی کی کی۔ ہندوستان میں وہ گورنر جنرل سے اپیل کر کے ناکام ہو ہی چکے تھے؛ اب انھوں نے ۹/ جنوری ۱۸۶۰ء کو مندرجہ ذیل درخواست وزیر ہند کی خدمت میں ولایت بھیجی:[1]

درخواست بنام وزیر ہند

۱۔ مجھے ملکۂ معظمہ کے اعلان معافی کے خلاف حبس دوامی بعبور دریائے شور

[1] قومی دفتر خانۂ ہند، نئی دہلی۔ فارن پولیٹیکل۔ ستمبر ۱۸۶۰ء، نمبر ۵۵۶

اور ضبطیِ جائیداد کی سزا دی گئی ہے۔ میں نے ہندوستان میں تمام حکامِ مجاز کی خدمت میں انصاف کی، یا کم از کم میری عمر کا خیال رکھتے ہوئے رحم کی درخواست کی، لیکن بے سود۔ اب میں اپنے آپ کو دادرسی کے لیے آپ کے قدموں میں ڈالتا ہوں۔

۲۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا اور صرف سپیشل کمشنر کے فیصلے کی اور حکومتِ ہند سے اپنی درخواست کی نقلیں ملفوف کرتا ہوں۔ انھی سے معلوم ہو جائے گا کہ مجھ پر مقدمہ چلانے، میرا جرم ثابت کرنے اور پھر مجھے سزا دینے میں حضور ملکۂ معظمہ کے اعلان کی منشا کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک درخواست کی نقل بھی بھیج رہا ہوں، جو کلکتہ کے متقدر مسلمانوں نے حکومتِ ہند کی خدمت میں میری رہائی کے لیے دی تھی۔ میں ذیل میں مختصراً چند باتیں بیان کر دیتا ہوں تاکہ میرے معاملے کی نوعیت واضح ہو جائے۔

۳۔ جیسا کہ سپیشل کمشنر نے بھی اپنے فیصلے میں ذکر کیا ہے، میرا خاندان اپنی دنیوی حیثیت کے لیے بہت حد تک سرکارِ انگریزی کا مرہونِ منت ہے۔ ایک زمانے میں خود میں بھی انگریزی ملازمت میں بہت اچھے عہدے پر متمکن تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں انگریزی حکومت کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب شورش کا آغاز ہوا ہے، میں ریاستِ الور میں ملازم تھا۔ میں اس کے چار مہینے بعد دہلی گیا تاکہ وہاں سے اپنی بیوی کو نکال لاؤں، جو خطرے میں گھر گئی تھی۔ میں اسے ساتھ لے کر اپنے

وطن خیرآباد چلا گیا اور مئی ۱۸۵۸ء تک وہاں رہا۔ وہاں سے ہمیں ایک شخص احمد اللہ شیخ کے تشدد مجرمانہ کی بدولت بھاگ کے بونڈی جانا پڑا؛ وہاں ہماری جان خطرے ہی میں تھی۔ بونڈی میں دو شخص ــ عبدالحکیم اور مرتضیٰ الحسین میرے خلاف ہو گئے؛ یہ دونوں شیعہ تھے۔ مجھے نقصان پہنچانے کی خاطر ان دونوں نے بیان دیا کہ انھوں نے سنا تھا کہ میں ممّو خان اور دوسرے باغیوں کے مشوروں میں شامل تھا اور قتل کے جواز کے فتوے دیتا تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب ہم بھاگ کر بونڈی آ رہے تھے تو ایک باغی سرغنے مسیح الزّماں نے ہمیں راستے میں گرفتار کر لیا۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت سختی کا سلوک کیا اور ہمیں کھیڑی میں نظر بند کر دیا۔ خوش قسمتی سے کھیڑی کے باشندے مجھے جانتے تھے؛ ان لوگوں کے کہنے پر مسیح الزّماں نے ہمیں رہا کر دیا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اگر کسی طرح کا میرا باغیوں سے تعلق پیدا ہوا بھی، تو میری مرضی کے خلاف تھا۔ ملکۂ معظمہ کے اعلان میں آخری تاریخ دسمبر ۱۸۵۸ء مقرر کی گئی تھی۔ اس میعاد کے گزرنے سے پہلے ہی میں سیتاپور کے اعلیٰ فوجی افسر کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ان سے اس معافی کی سند بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد میں انھی کی زیرِ ہدایت اپنے مکان پر خیرآباد چلا آیا اور یہاں پہنچ کے میں نے وہ سند خیرآباد کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں داخل کرا دی۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں مجھے زیرِ حراست لکھنؤ لائے اور یہاں مجھ پر مقدمہ قائم ہوا اور مارچ میں میرے خلاف فیصلہ ہوا۔ میں نے اس سلسلے میں جو درخواست

حکومتِ ہند میں پیش کی تھی، اس ( ) سے اس فیصلے کی غلطی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی نقل لف ہذا ہے۔

۴۔ جب میں نے چیف کمشنر سے اس فیصلے کے خلاف اپیل کی تو مجھے ۷ اپریل ۱۸۵۹ء کو اطلاع ملی کہ وہ اپیل کی سماعت نہیں کر سکتے بلکہ مقدمہ اس سے پہلے ہی حکومت ہند کے پاس بھیجا جا چکا ہے اس پر جب میں نے اپنی اپیل حکومت کو بھیجی تو میرے وکیل مسرز سُون ہو بیلی و لیزلی (Swinhoe Beely And Leslie) کو خط مورخہ ۱۱ مئی ۱۸۵۹ء کے ذریعے مطلع کیا گیا کہ یہ مقدمہ گورنر جنرل با اجلاس کونسل کی خدمت میں پیش ہوا تھا، جہاں سے سپیشل کمشنر نے جو سزا دی تھی، اس کی توثیق کر دی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس فیصلے کے خلاف جو دلائل میں پیش کرنا چاہتا تھا، ان پر غور کیے بغیر ہی آخری فیصلہ میرے خلاف کر دیا گیا۔ اس پر میں نے پھر درخواست ارسال کی، جس کا جواب مجھے ۷ اکتوبر کے مکتوب میں ملا کہ یہ رُد کی جاتی ہے۔

۵۔ کلکتہ کے معزز ترین مسلمانوں نے، جن کی وفاداری سے متعلق کسی قسم کا شبہہ نہیں، قاضی القضاۃ کی سرکردگی میں جو حکومت کا سب سے بڑا مسلمان افسر ہے، حکومت ہند سے اکتوبر (۱۸۵۹ء) میں درخواست کی کہ میری بے گناہی کے علاوہ میری پیری اور ضعفِ جسمانی کے پیشِ نظر مجھے رہا کر دیا جائے۔ لیکن حکومت نے اس درخواست پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔

۶۔ ان حالات میں اب میرے پاس اس کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ آپ سے درخواست کروں کہ میرے خلاف نفسِ مقدمہ، اس کے فیصلے اور سزا سے ملکۂ معظمہ کے اعلانِ معافی کی خلاف ورزی ہوئی ہے، جس کی رُو سے قاتلوں اور بغاوت کے سرغنوں اور محرکوں کے علاوہ اور سب کو معافی کا وعدہ دیا گیا تھا۔ میری حیثیت ہی کیا ہے! میں نہ باغی ہوں، نہ باغیوں کا ساتھی۔ کمشنر نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ میں بہت خطرناک آدمی ہوں اس لیے انصاف اور امنِ عامّہ کا تقاضا یہ ہے کہ مجھے ملک سے باہر بھیج دیا جائے۔ بڑے بڑے سردار جو بغاوت کے سرغنے اور مشہور قاتل تھے، وہ تو رہا کر دیے گئے، بلکہ ان میں سے بعض کو پنشن بھی مل رہی ہے لیکن برطانوی حکومت مجھ ناچیز بوڑھے سے ڈرتی ہے، جو کہ قبر کے کنارے پہنچ چکا ہے۔

میری درخواست یہ ہے اور انصاف کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ مجھے رہا کر دیا جائے اور میری ضبط شدہ جائیداد بحال کر دی جائے ورنہ کم از کم رحم ہی کے طور پر یہ کیا جائے۔

۹ر جنوری ۱۸۶۰ء

مقدمے کے کاغذات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر وزیر ہند نے حکم دیا کہ یہ درخواست تمام متعلقہ کاغذات کے ساتھ ہندوستان کے مقامی حکام کے پاس بھیج کر ان سے دریافت کیا جائے کہ مولانا کو رہا کر دینے کی صورت میں انھیں تو کوئی عذر نہیں ہوگا۔ مختلف دفتری مراحل طے کرتے ہوئے یہ کاغذات جب چیف کمشنر اودھ کے پاس پہنچے تو اس نے ۱۲ر اگست ۱۸۶۱ء کو جواب دیا کہ اگر اس

قیدی (مولانا فضل حق) کے ساتھ کسی طرح کی معمولی سی رعایت بھی کی گئی تو وہ اس کی سخت مخالفت کریں گے۔

ظاہر ہے کہ چیف کمشنر کی اس رائے کے بعد ہندوستان یا ولایت کے حکام بالا مولانا کی مندرجہ صدر درخواست پر کس طرح غور کر سکتے تھے! یاد رہے کہ چیف کمشنر صاحب کے اس آخری جواب کی تاریخ ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء ہے اور اس کے ہفتہ بھر بعد ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا کا پورٹ بلیر میں انتقال ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

اب ذرا یہ عبارت پڑھیے:[۱]

..... علامہ موجود نہ تھے کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔ وہ (سپرنٹنڈنٹ جیل انگریز) یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا۔ گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔ ادھر علامہ (فضل حق) کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بیخبر میر منشی لفٹننٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ پروانہ رہائی حاصل کر کے مولوی شمس الحق انڈیمان روانہ ہو گئے وہاں جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدھام تھا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق کا انتقال ہو گیا۔ اب سپرد خاک کرنے جا

---

[۱] باغی ہندوستان، ۱۷۶ - ۱۷۷

رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت ویاس شریکِ دفن ہوئے اور بے نیلِ مرام واپس لوٹے۔

قسمت کی بد نصیبی! کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

افسوس! ہمیشہ کے لیے یہ آفتابِ علم و عمل دیارِ غربت میں غروب ہو گیا۔ اب تک مزارِ مرجعِ انام و زیارت گاہِ خاص و عام ہے ....

اوپر جو واقعات بیان کر چکا ہوں انھیں مدِ نظر رکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ یہ ڈرامائی سین کہاں تک قابلِ اعتبار ہے!

یاد رہے کہ گورنر جنرل باجلاسِ کونسل یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ ان سے مشقت نہیں لی جائے گی، اور ان سے کسی طرح کا اہانت آمیز سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ اس صورت میں یہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آنے کی بھی خوب رہی۔

پھر یہی نہیں، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مولوی شمس الحق صاحب ۲۰ راگست کو یعنی جس دن مولانا کا انتقال ہوا، یا بالفرضِ محال اگر تدفین اگلے دن ہوئی ہو، تو ۲۱ راگست کو سہی، انڈیمان پہنچے تھے۔ انڈیمان کے سفر میں جو مشکلات اس زمانے میں پیش آئی ہوں گی، ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لکھنؤ سے خشکی کے راستے کلکتے اور کلکتے سے بحری جہاز کے ذریعے انڈیمان مہینوں نہ سہی، آپ مہینہ بھر سے کم کیا کہیں گے۔ گویا وہ ۲۰ رجولائی کے لگ بھگ یہاں سے روانہ ہوئے اور لا محالہ "پروانہ رہائی" اس سے پہلے صادر ہو گیا ہو گا۔ جب چیف کمشنر ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا کی رہائی کے خلاف اظہار رائے کر رہا ہے، تو کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ مولوی شمس الحق صاحب یہ پروانہ لے

کر ۲۰ جولائی کو یہاں سے روانہ بھی ہو چکے تھے!

ایک اور بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر رہائی کا حکم صادر ہو ہی گیا تھا تو مولوی شمس الحق کو اسے دستی لے کر انڈیمان جانے کی کیا ضرورت تھی! اور کیا حکومت قیدیوں کی رہائی کے احکام ان کے رشتہ داروں اور متعلقین کے حوالے کر دیا کرتی ہے! پھر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کے ذہن میں پورٹ بلیر نہیں بلکہ دہلی یا آگرہ یا لکھنؤ ہے جہاں جنازے کے ساتھ "اژدھام" ہو سکتا ہے۔ انڈیمان کا جزیرہ عمر قیدیوں کے لیے اسی، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ۱۸۵۸ء ہی میں مقرر ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں یعنی تقریباً ایک صدی بعد بھی یہاں کی ساری آبادی پچیس ہزار سے بھی کم تھی۔ اسی سے صرف اس کے صدر مقام پورٹ بلیر کی آج سے ایک صدی پہلے کی آبادی کا اندازہ کیجئے اور پھر یہ سوچئے کہ اس میں مسلمان کتنے ہوں گے اور پھر لفظ "اژدھام" پر غور کیجئے۔ اقتباس کی آخری سطر ہے:

اب تک مزار مرجع انام اور زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیسے لکھ گئے؛ یہ تاریخ و سیرت کی زبان نہیں۔ غرض اس سارے کی افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں۔

(۸)

آئیے، اب ان دعاوی پر نظر ڈالیں، جو مولانا فضل حق کے سیرت نگاروں نے ان سے منسوب کیے ہیں اور جنھیں ہم اس مضمون کے آغاز میں نقل کر چکے ہیں اور دیکھیں کہ یہ صداقت کی کسوٹی پر کس حد تک پورے اترتے ہیں۔

دعویٰ (۱): "مولانا فضل حق پر مقدمہ" سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتوئ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت کی بناء پر قائم ہوا۔"

آپ نے اوپر مقدمہ کی پوری رُوداد پڑھ لی اور فردِ جرم بھی دیکھ لی۔ اس سے معلوم

ہوگا کہ اس دعویٰ کی تینوں شقیں ٹھیک نہیں، بنائے مقدمہ ان تینوں میں سے کوئی بھی نہیں تھی۔ یا کم از کم وہ واقعات نہیں تھے، جن کی طرف اس دعوے میں اشارہ کیا جاتا ہے۔ اور یقیناً انھوں نے کوئی ایسا فتویٰ نہیں دیا تھا، جس میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہو۔

دعویٰ (۲): "جس جج کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تھا، وہ ان کا شاگرد تھا اور اسی لیے اسے ان سے ہمدردی تھی اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ یہ بری ہو جائیں۔" یہ مقدمہ ابتدائی مرحلے پر کپتان تھربرن کے سامنے پیش ہوا اور اس کے بعد مسٹر جارج کیمبل سپیشل جوڈیشنل کمشنر اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیر آباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت میں پیش ہوا تھا۔ ان تینوں میں سے کسی کے کسی زمانے میں بھی مولانا مرحوم کے ساتھ کام کرنے یا ان سے کام سیکھنے کا امکان نہیں۔

دعویٰ (۳): "جیوری میں ایک اسیسر بھی مولانا کو بری کر دینے کے حق میں تھا۔" اس مقدمے میں جیوری مقرر ہی نہیں ہوئی تھی۔ دراصل یہ عدالت فوجی (مارشل لا) قسم کی تھی؛ ایسی عدالتوں میں جیوری نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے اس کے کسی رکن کے ان کی بریت کے حق میں ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دعویٰ (۴): "مولانا فضلِ حق نے خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل "مثل تارِ عنکبوت عقلی اور قانونی اولہ" سے توڑ دیے تھے اور امید تھی کہ وہ بری کر دیے جائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے خود اقرار کیا کہ جس فتویٰ کی بنا پر یہ مقدمہ قائم ہوا ہے، وہ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے، اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔" مولانا کا وہ خط بھی آپ نے دیکھا جو انھوں نے نواب رام پور کو لکھا تھا اور ان کا عدالت میں بیان بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ میں نے بغاوت میں کوئی حصّہ نہیں لیا، مجھے ایک میرے ہمنام

میر فضل حق شاہجہانپوری کی جگہ دھوکے میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس بات کا انھوں نے کئی مرتبہ اعادہ کیا ہے۔ استغاثہ کے گواہوں پر جرح کے وقت بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک اور فضل حق سرگرم باغی رہا ہے۔

جہاں تک فتویٰ کا سوال ہے، اصلی فتویٰ مولانا عرشی نے اخبار الظفر دہلی سے لے کر اپنے مضمون میں نقل کر دیا ہے۔ اس کے آخر میں جن علماء کے دستخط ہیں، ان میں مولانا فضل حق کا نام ہی سرے سے نہیں۔ درحقیقت عدالت جس فتویٰ کی طرف اشارہ کر رہی ہے، وہ محض یہ ہے کہ ان کے قول کے مطابق جب عبدالحکیم کو ممّو خان اور مولانا کے سامنے پیش کیا گیا ہے، تو مولانا نے قرآن کی آیت پڑھی ہے[ا]

[ا] قصیدۂ ہمزیہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"میرا اس کے سوائے کوئی جرم نہیں کہ مجھے ان نصاریٰ (یعنی انگریزوں) سے کسی قسم کی محبت اور دوستی نہیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان سے دوستی قرآن کی نصِّ محکم کی رو سے کفر ہے۔ کسی حق پرست انسان کو اس میں شبہہ نہیں ہو سکتا اور ان (نصاریٰ) سے دوستی جائز بھی کیونکر ہو سکتی ہے! یہ بھرے دشمن اس ذاتِ پاک (یعنی رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم) کے جن کی خاطر یہ زمین و آسمان اور تمام کائنات پیدا کی گئی ہے" (باغی ہندوستان: ۴۴۸)

یہاں ان کا اشارہ غالباً قرآن کی اس آیت کی طرف ہے:

اے مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ یہ تمہاری مخالفت میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ تم میں سے جو کوئی انھیں دوست اور مددگار بنائیگا تو وہ انھی میں سے سمجھا جائیگا۔ اللہ ان لوگوں کو (کامیابی) کی راہ نہیں بتاتا جو ظلم کرنے والے ہیں۔

جس کا مفاد یہ تھا کہ جو شخص نصاریٰ کا دوست ہے، وہ گویا انھی میں سے ہے۔ پس اس کا قتل جائز ہے اگرچہ خود مولانا مرحوم سے اس واقعہ سے ہی انکاری ہیں، لیکن اگر بفرضِ محال یہ درست بھی ہوتا جب بھی تو یہ وہ فتویٰ جہاد نہیں جو ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں دیا گیا تھا اور جس کی طرف مولانا کے سیرت نگاروں نے اشارہ کیا ہے۔ پس یہ متہورانہ بیان، جو ان سے منسوب کیا جاتا ہے کہ "فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے" کس طرح درست اور حسبِ حقیقت ہو سکتا ہے؟

دعویٰ (۵): اس اقرار واقبال کے بعد عدالت نے بجد رنج کے ساتھ "حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم دیا۔ عدالت کے رنج کا سوال ہی کہاں پیدا ہوا؟ استغاثہ نے جو الزام ان پر عائد کیے تھے، عدالت کے نزدیک وہ ثابت ہو گئے تھے۔ پس انھوں نے انھیں مجرم گردانا اور انھیں سزا دے دی۔ بلکہ جوڈیشنل کمشنر تو یہ دیکھتا ہے کہ انھیں سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور خاص طور پر انھیں جلاوطن کر دینا چاہیے۔ کیا اظہارِ رنج اسی طرح کیا جاتا ہے!

دعویٰ (۶): "یہ فیصلہ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سُنا۔"

اگر انھوں نے یہ فیصلہ "مسرت اور خندہ پیشانی" سے سُنا تھا تو اس کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ (۱) جو الزام ان پر لگائے گئے تھے ان کے نزدیک وہ صحیح تھے؛ اور (۲) وہ جانتے تھے کہ ان کا نتیجہ یہی سزا ہونا چاہیے تھی، جو مجھے دی گئی ہے؛ اور (۳) میں نے پہلے کارِ ثواب کیا تھا، اب اس سزا کے بعد درجۂ شہادت حاصل کر رہا ہوں۔ کیا ان میں سے کوئی صغریٰ وکبریٰ بھی درست ہے؟

وہ بار بار حکومت سے درخواست کرتے ہیں، خود بھی لکھتے ہیں اور دوسروں سے بھی لکھواتے ہیں کہ میں بے گناہ اور مظلوم ہوں۔ دشمنوں اور چغلخوروں نے مجھے اس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ بلکہ اپنی پیرانہ سالی اور مصیبتوں کے ساتھ اپنی اولاد کی صغر سنی

اور عسیر الحالی کا درد ناک قصہ بیان کر کے حکومت سے رحم کی التجا کرتے ہیں کہ مجھے رہا کر دیا جائے۔ خدا سے بھی گڑگڑا کے دعائیں کرتے ہیں کہ بارِ الہا! مجھے اس ابتلاء سے نجات دلوا۔

اگر انھوں نے فیصلہ "مسرت اور خندہ پیشانی" سے سنا ہوتا، تو کیا ان کا یہی رویّہ ہوتا!!

(۹)

غرض پورے حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انھوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو اور اس کی طرف انھوں نے ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے) لیکن جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے۔ نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے؛ انھوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا، نہ تلوار ہی اٹھائی۔

آج تک ان کی نسبت جو غلط باتیں مشہور رہی ہیں، دراصل یہ نتیجہ تھیں ہماری اس خواہش کا کہ ہم انھیں نہ صرف بزمِ علم و عقل اور مجلسِ قال اقول ہی میں صدر نشین، بلکہ "جنگ آزادی" میں بھی برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر اتفاق سے بعض غیر محتاط اور غلط روایات نے ہماری اس خواہش کی تکمیل کے لیے سامان بھی فراہم کر دیا اور ہم نے بے جھجک انھیں تسلیم کر لیا اور اس پر کوئی ہمیں ملامت نہیں کر سکتا، کیونکہ پورے واقعات تک ہماری رسائی ہی نہیں ہوئی تھی، لیکن اب کہ حقیقت وا شگاف ہو کر ہمارے سامنے جلوہ افروز ہو گئی ہے۔ ہمیں اپنی گذشتہ غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے۔ بلاشبہ اتنی لمبی مدت کے معتقدات کو ترک کرنا آسان نہیں اور خوش اعتقادی ہمیں اس سے بغاوت پر ابھارے گی، لیکن مرحوم کی صحیح عزت اسی

میں ہے کہ ہم انھیں ان کے صحیح مقام پر بٹھائیں نہ کہ غلط باتیں ان سے منسوب کرکے ان کا ایک فرضی بُت بنائے رکھیں جو ممکن ہے خوبصورت تو ہو لیکن اصل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ لیکن سوچیے تو کہ آخر ہمیں اس پر کسی طرح کا رنج اور افسوس کیوں ہو؟ ان کی علمی اور ادبی اور دماغی صلاحیتوں کے باعث ان کا جو مقام ہماری نظروں میں ہے، وہ تو بہر حال اپنی جگہ پر قائم ہے۔ انھوں نے علم و فضل کی جو شمع روشن کی تھی، وہ بحمدہٖ اب بھی پوری تابناکی سے ہماری علمی مجلسوں میں اُجالا کر رہی ہے اور ان کا یہ صدقہ جاریہ خدا چاہے تو رہتی دنیا تک ہمارے دل و دماغ کے لیے سامانِ تسکین مہیّا کرتا رہے گا، رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

افضل حق قرشی

مولانا فضل حق خیر آبادی

اور

جہاد آزادی

مولانا فضل حق نے ۱۶-۱۸۱۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔ وہ دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ یہاں انھیں وہ عزت و احترام میسر نہ تھا، جس کے وہ مستحق تھے، چنانچہ مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد دہلی ریذیڈنسی کے ایک جاگیر دار نواب فیض محمد خان کے ہاں جھجر پہنچے۔ وہ ایک مدت تک مصاحبت نواب میں رہے۔ آخر کار یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ جھجر کے بعد سہارنپور گئے۔ ان کے بڑے بھائی فضل عظیم وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وہ ولیم فریزر کے معتمد خاص تھے۔ مولانا غالباً یہاں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے وابستہ رہے۔ سہارن پور کے بعد رام پور گئے۔ وہاں وہ نوابان رام پور محمد یوسف علی خان اور محمد کلب علی خان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ محکمہ نظامت اور پھر مرافعہ عدالتیں پر مامور رہے۔ رام پور سے لکھنؤ گئے۔ واجد علی شاہ کا دورِ حکومت تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ کی فہمائش پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے سپاہیوں کے حقوق کی حفاظت اور دادرسی کے لیے ۱۸۴۸ء میں "حضور تحصیل" کے نام سے ایک نئی عدالت قائم ہوئی، تو مولانا فضل حق اس کے صدر الصدور مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۶ء تک وہاں رہے، پھر راجہ بنے سنگھ کے ہاں الور چلے گئے۔ بعد ازاں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت

اُبھارنے کے الزام میں گرفتار ہوئے۔

انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے کیا اور ان کی زندگی کا خاتمہ بھی کمپنی کی حکومت کی ملازمت میں ہوا۔ لیکن انقلاب ۱۸۵۷ء میں شرکت کے الزام کی بناء پر سزا ئے عمر قید نے انھیں ممتاز بنا دیا۔ بعض مصنفین انقلاب ۱۸۵۷ء میں ان کی شرکت کو اظہار پشیمانی کے طور پر لیتے ہیں کہ وہ اپنی رفاقتوں کا کفارہ ادا کر رہے تھے، لیکن یہ حقائق کی غلط توجیہہ ہے۔ ایسا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں، جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ ۱۸۵۶ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے ان کا کوئی بنیادی پالیسی اختلاف تھا۔ اس ضمن میں تاریخ کی شہادت اور واقعات کا تجزیہ حقائق کا آئینہ شفاف بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ اس لیے بھی کہ تاریخ بہرحال عقیدہ نہیں تجزیہ ہے۔ ۱۸۵۵ء میں جب وہ لکھنؤ میں صدر الصدور تھے، ہندوؤں نے اجودھیا میں عالم گیری مسجد شہید کر دی۔ مولانا سید امیر علی نے ہندوؤں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ انگریزوں کو سید امیر علی کا یہ فعل پسند نہ آیا۔ جنرل اوٹرم ریذیڈنٹ، واجد علی شاہ سے ملا اور اُسے بتایا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم فساد ہونے والا ہے۔ کہیں کشت و خون تک نوبت نہ پہنچے۔ حکومت پر اس کا تدارک اور انتظام لازم ہے۔ مولوی امیر علی اس کا بانی ہے۔ اُسے قرار واقعی سزا دینی چاہیے۔

جب اس سلسلے میں علماء سے فتویٰ طلب کیا گیا تو مولانا فضل حق نے مفتی سعد اللہ اور بعض دوسرے علماء کے ساتھ سید امیر علی کے قتل اور جہاد ہنومان گڑھ کے خلاف مشترکہ فتویٰ دیا۔ نجم الغنی رام پوری 'تاریخ اودھ' میں لکھتے ہیں:

"لیکن بعض دنیا طلب علمائے اہل سنت نے جیسے مولوی حسین احمد اور مولوی غلام جیلانی وکیل عدالت انگریزی اور

مولوی محمد یوسف اور مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولوی سعد اللہ
اور دوسرے علمائے گمنام نے محض بطمع دنیا مولوی امیر علی صاحب
کے قتل کا فتویٰ عبارات مختلف سے رنگین کر کے دیا اور
دِلّی کے بعض علماء نے بھی ایسی برہان اور حجت کے ساتھ لکھا
کہ جب اہلِ اسلام قلیل ہوں اور کفار کا غلبہ ہو، اُس وقت
خلاف حکم اولوالامر یعنی حاکم وقت کے جن کے اختیار میں ہوں،
خواہ انگریز ہوں یا مسلمان جہاد حرام ہے۔ پس جو شخص ایسے
امر کا مرتکب ہو وہ طاغی و باغی ہے۔[1]

اس فتویٰ میں علماء نے انگریزوں کو اولی الامر تک کہا۔ سید امیر علی اور
ان کے ساتھی شہید کر دیے گئے۔

اس حادثہ کے بعد انقلاب ۱۸۵۷ء میں مولانا کی فعال شمولیت بتائی جاتی ہے
جس کے ضمن میں بعض مصنفین نے تو کئی ناقابل یقین داستانیں تک وضع کی ہیں۔
ایک داستان کے مطابق:

۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش
یا جرمِ بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔
مقدمہ چلا مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بیٹھی ایک
اسیسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔
سرکاری وکیل کے مقابل مولانا خود بحث کرتے تھے، بلکہ
لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور خود ہی مثل

---

[1] محمد نجم الغنی رامپوری۔ تاریخ اودھ۔ ج ۵ (لکھنؤ: نولکشور ۱۹۱۹ء) ص ۲۲۲-۲۲۳۔

تارعنکبوت عقلی و قانونی اولہ سے توڑ دیئے۔ جج یہ رنگ دیکھ
پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدرالصدوری
کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصے کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی
عظمت و تبحر سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا
کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے۔ ظاہر یہ تھا کہ
مولانا بری ہو جائیں گے۔ سرکاری وکیل لاجواب تھے.......

دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لیے تھے، ایک ایک کر کے سب رد کر دیے، جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی تھی، اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی، فرمایا:

"پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری رائے وہی ہے۔

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مخبر نے عدالت کا رخ اور علامہ کی بارعب و پُر وقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں، وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسن صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا، مگر علامہ کی شانِ استقلال کے قربان جائیے، خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔

.... علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔ بعید رنج کے ساتھ عدالت نے حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سُنا۔[1]

تاہم یہ داستان تاریخی شہادتوں سے یکسر مطابقت نہیں رکھتی۔ داستان میں ان دو نکات پر زور دیا گیا ہے کہ:

۱۔ مولانا نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتویٰ پر دستخط کیے تھے۔

۲۔ جج کا رویہ مولانا سے دوستانہ تھا اور وہ انہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

یہ دونوں نکات تاریخی شواہد کے مطابق نہیں ہیں، کیونکہ جہاد کا فتویٰ پہلے اخبار الظفر دہلی میں اور بعد ازاں صادق الاخبار دہلی کے ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا جس میں مولانا فضل حق کا نام دستخط کنندگان میں شامل نہیں، جبکہ دوسری شہادت سید مبارک شاہ کی ہے۔ جو جنگِ آزادی کے دوران دہلی کے کوتوال تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فضلِ حق نے جہاد کے حق میں کوئی فتویٰ نہیں دیا یا کسی بھی طریقہ سے بادشاہ کو گمراہ نہیں کیا۔"[2]

جہاں تک جج کے دوستانہ رویے کا تعلق ہے۔ اس ضمن میں مولانا کا اپنا بیان ملاحظہ ہو۔ وہ باغی ہندوستان میں لکھتے ہیں:

---

[1] فضلِ حق خیر آبادی۔ باغی ہندوستان، مترجمہ محمد عبدالشاہد خان شروانی (بجنور: مولوی محمد مجید حسن، ۱۹۴۷ء) ص: ۱۶۸-۱۷۱

[2] Michael Edwardes, *Red Year ; the Indian Rebellion of 1857* (London : Cardinal, 1975), 212.

"میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا، جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا۔"[1]

مولانا جنگِ آزادی میں شریک نہیں تھے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ دہلی خصوصاً باغیوں سے ملنے نہیں گئے تھے۔ بلکہ خود ان کے مطابق:

"اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل و عیال موجود تھے اور مجھے بلایا بھی گیا تھا۔ ساتھ ہی فلاح، کامیابی کشائش و شادمانی کی اُمید بھی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ تو پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا۔ میں نے دہلی کا رُخ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر اہل و عیال سے ملا۔ اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا، لیکن نہ انھوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔"[2]

مولانا کی دوسری بیوی امراؤ بیگم اور ان سے دو بیٹے محمد شمس الحق اور محمد علاء الحق دہلی میں محلہ بلی ماراں بارہ دری شیر افگن میں مقیم تھے۔ فلاح، کامیابی، کشائش و شادمانی کی اُمید، کیا تھی؛ عبداللطیف کے ۱۸۵۷ء کے روزنامچے کا مندرجہ ذیل اندراج اس پہلو پہ روشنی ڈالتا ہے:

"جب زمانہ میں شور و شر پھیلا تو مولوی فضل حق خیر آبادی نے دہلی کا عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے۔ نذر اور نثار کے لیے بہت سا روپیہ پیش کیا۔ وہ حصولِ عہدہ کے خواہشمند تھے۔"[3]

---

[1] باغی ہندوستان، ص ۴۱۷۔ [2] باغی ہندوستان، ص ۳۷۸

[3] عبداللطیف۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ مرتبہ و مترجمہ خلیق احمد نظامی (دہلی ندوۃ المصنفین ۱۹۵۸) ص ۱۶۲

لیکن بادشاہ نے انھیں صبر کی تلقین کی۔ مولانا نے اپنی عقل وفہم کے مطابق لوگوں کو اپنی کس رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا، جسے انھوں نے قبول نہ کیا ؟ منشی جیون لال کے ۱۸۵۷ء کے روزنامچے سے یہ عقدہ کھلتا ہے۔ جیون لال لکھتا ہے۔:

"مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے گا۔ شہر کو مسمار کر دیا جائے گا اور بادشاہ کے گھرانے میں ایک بھی آدمی ایسا نہ چھوڑا جائیگا جو بادشاہ کا نام لے یا اُسے پانی کا ایک قطرہ بھی دے سکے۔ اس کے بعد مولوی نے کہا کہ حضور کو مناسب ہے کہ سپاہیوں کو ترغیب دے کر انگریزوں کے مقابلے سے روک دیا جائے، کیونکہ وہ کسی نوع انگریزوں پر فتح نہیں پا سکتے۔" [۱]

اسی رائے اور مشورہ کی بنا پر مجاہدین جنگِ آزادی کے نزدیک مولانا کی پوزیشن مشکوک تھی۔ انھیں بہادر شاہ ظفر کی مجلس مشاورت میں شرکت کی اجازت نہ تھی۔ سید مبارک شاہ لکھتے ہیں:

"بادشاہ کی مجلس مشاورت بخت خان اور سرفراز علی پر مشتمل تھی اور کسی حد تک فضل حق بھی، مگر بادشاہ کے چاہنے کے باوجود مؤخر الذکر کو مجلسِ مشاورت میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔" [۲]

جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور وہاں لاقانونیت کا دور دورہ تھا تو مولانا اپنے خاندان کے ساتھ دہلی چھوڑ گئے۔ کچھ عرصہ تک روپوش رہے۔ پریشان حال زندگی بسر

---

[۱] - جیون لال - غدر کی صبح شام - مترجمہ، ضیاء الدین احمد برنی (دہلی: حلقۂ مشائخ بک ڈپو، ۱۹۲۶ء) ص ۲۲۰۔ [۲] Red Year ص ۲۱۲۔

کر رہے تھے کہ انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کا اعلانِ معافی سُنا تو اپنے وطن میں پہنچ گئے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"میں مسافرت، غربت، اضطراب، مصیبت کی زندگی گزار رہا تھا اور میرا اشتیاق در غبت، اپنے گھر، اہل وعیال، پڑوسی اور احباب تک پہنچنے کے لیے بڑھ رہا تھا کہ امن وامان کا وہی پروانہ جسے قسموں سے مؤکد کیا گیا تھا، نظر پڑا، اس پر بھروسہ کرکے اہل و وطن میں پہنچ گیا۔[۱]

عام معافی کا اعلان تمام رعایا کے لیے تھا۔ ماسوا اُن لوگوں کے جن کی نسبت ثابت ہوا یا ثابت ہو کہ وہ رعایا کے قتل میں بذاتہ شریک ہوتے۔ جنھوں نے جان بوجھ کے قاتلوں کو پناہ دی یا جو باغیوں کے سردار ہوئے یا ترغیب بغاوت دی۔

اپنے آپ کو ان سے مبرّا جانتے ہوئے مولانا اپنے ٹھکانے سے باہر آئے۔ لیکن انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"تھوڑے دنوں کے بعد ایک حاکم نصرانی نے مجھے مکان سے بلا کر قید کر دیا اور رنج وغم میں مبتلا و مقید کرکے دارالسلطنت (لکھنؤ) جو دراصل اب خانۂ ہلاکت تھا، بھیج دیا۔"[۲]

انھیں نظامت پیلی بھیت، چکلہ داری، ریاست محمدی اور افسری لشکر باغی کے الزامات میں گرفتار کیا گیا تھا۔ دورانِ مقدمہ مولانا نے نواب یوسف علی خان والیٔ رامپور کے نام ایک خط[۳] لکھا جس میں ان ہر تین الزامات سے اپنے آپ کو بری قرار دیا اور تحریر

---

[۱] باغی ہندوستان ص ۴۱۶۔ [۲] باغی ہندوستان ص ۴۱۷۔

[۳] مولانا امتیاز علی عرشی کے مطابق مولانا فضل حق نے دوران مقدمہ (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

کیا کہ وہ محض ہمنامی کی وجہ سے بے گناہ پکڑے گئے ہیں۔ ان سے درخواست کی کہ وہ زرپ صاحب کمان افسر بریلی محکمہ اسپیشل کمشنر لکھنؤ کے نام ایک سفارشی خط لکھیں، جس سے ان کی برائت ظاہر ہو، حکام کے شکوک و شبہات رفع ہوں اور وہ رہائی پا سکیں۔ وہ لکھتے ہیں:

شدہ باشد۔ دم روبکاری ایں جا واضح شد کہ فدوی را بعلت نوکریِ خان بہادر خان و نظامت بریلی بھبیت و چکلہ داریِ محمدی و افسریِ لشکرِ باغی ماخوذ کردہ اند، حال آنکہ فدوی ازیں ہر سہ امر محض

(حاشیہ صفحہ سابقہ) نواب رامپور فرزند دلبند دولت انگلشیہ نواب یوسف علیخان (جو مولانا کا شاگرد تھا اور جس کے ہاں مولانا مختلف حیثیتوں میں ملازم رہے) کو تین خط لکھے۔ ان خطوط میں انھوں نے نواب سے درخواست کی کہ وہ ان کے بارے میں انگریزوں سے سفارش کرے اور انھیں رہائی دلانے میں مدد دے۔ پہلے دو خط محفوظ نہ رہے یا محفوظ نہ رکھے گئے۔ تیسرا خط رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس خط کے استناد کو ایک حلقے کی جانب سے چیلنج کیا گیا ہے کہ یہ اصل نہیں۔ اس کے مقابل یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ جعلسازی کس نے اور کیوں کی؟ اور یہ کیسے ریاست کے کتب خانے میں آیا، جس کا حکمران مولانا کا مہربان تھا، نہ صرف وہ وہاں ملازم رہے بلکہ ان کے فرزند شمس العلماء مولانا عبدالحق نے بھی وہاں ملازمت کی اور مولانا کی وفات کے بعد بھی ایک طویل عرصہ تک وہاں پڑھاتے رہے۔ یہ کہنا تو آسان ہے کہ ایک دستاویز جعلی ہے، لیکن اسے ثابت کرنا مشکل ہے۔ نہ تو اندرونی اور نہ ہی بیرونی شواہد یہ ثابت کرتے ہیں کہ عرشی صاحب کا شائع کردہ خط تاریخی اعتبار سے درست نہیں۔ اس کے مندرجہ جات ان اپیل ہائے رحم سے ملتے ہیں جو مولانا نے اپنی سزا کے خلاف انگریز حکمرانوں سے کیں اور جنھیں مالک رام نے شائع کر دیا ہے۔

بری است، و منشاءِ مواخذہ آنست کہ شخصے مسمیٰ فضلِ حق نام از سادات شاہ جہاں پور کہ قبل ازیں در سرکار ابد قرار بندگان عالی ملازم ماندہ بسر رشتہ داری پیلی بھیت مامور شدہ، و زمانے تحصیلدار آنولہ و پیلی بھیت ماندہ بود، و در ابتدائے غدر از طرف خان بہادر خان ناظم پیلی بھیت گردید و بعدِ فتح بریلی در ملکِ اودھ رسیدہ از طرفِ خان علی خان چکلہ دارِ محمدی شدہ۔ پس از زمانے با فسری کدامی لشکر باغی ہمراہ فیروز شاہ آں طرف جمن فرار کرد۔ عزیزانِ او در سرکار کمپنی بعہدہائے جلیلہ مامور اند۔ چنانچہ برادر حقیقی او مولوی مبین ڈپٹی کلکٹر سہارنپور بود۔

مہتمانِ اخبار خانہ خراب ناواقف ازیں تفصیل کہ او شخصے دیگر است و فدوی از شیوخ خیر آباد شخصے دیگر، در اخبار نامہا حال نظامت پیلی بھیت و محمدی و افسری لشکر و فرار او با فیروز شاہ آں طرفِ جمن نوشتہ بعض علامات فدوی افزودند کہ برادرِ حقیقی او در سرکار مہاراجہ پٹیالہ نوکر و برادر دیگرش در سہارنپور ڈپٹی کلکٹر است و حاکمان ایں جا بہ اشتباہ ہماں مولوی فضلِ حق کہ ہمنام و در بعضے علامات شریک فدوی است، فدوی را محض بے جرم مقید کردہ اند۔

لہٰذا عرض رسا نست کہ اسماعیل خان رئیس مالاگڑھ دریں روزہا وارد آں دیار اند، و از حال فدوی و مولوی فضلِ حق شاہجہانپوری مذکور بخوبی واقف۔ بایشاں ایما رود، تا ایشاں کیفیت تفصیلی مشارٌ الیہ و حالِ عبورِ او دریائے جمن را ہمراہِ فیروز شاہ و حالِ بے جرمی

فدوی نوشتہ مع عرضی خود بنام ترپ صاحب کمان افسر بریلی متضمن درخواست ارسال کیفیت مذکور بذریعہ چھٹی خود محکمہ اسپیشل کمشنر لکھنؤ خدمت ترپ صاحب موصوف روانہ دارند و در کیفیت تغائر بسیار میان فدوی و فضل حق شاہ جہانپوری ثابت سازند، و نوکر بودن فدوی بسرکار کدامی باغی وافسر بودن فدوی بکدامی لشکر و ناظم نماندن فدوی بعلاقہ بریلی بعیت محمدی، ایں جملہ امور واقعی است، بوجہ احسن ثبت کنند، تا صاحب موصوف عرضی و کیفیت مرسلہ ایشاں را بہمراہ چھٹی خود دریں جا روانہ فرمایند و بواسطہ آں چھٹی و کیفیت اشتباہ حکام ایں جا رفع شود و نمک خوار قدیم رہائی یافتہ بدعائے ترقی و جاہ (مشغول) گردد۔ از پرورش خاوندانہ و مواسات کریمانہ امیدوار است توجہ بسیار بحال زارم مبذول شود و بعجلت ہر چہ تمامتر اثر اجابت مسئول ظاہر گردد۔[1]

مولانا کا خاندان اپنی دنیوی حیثیت کے اعتبار سے بہت حد تک سرکار انگریزی کا مرہونِ منت تھا۔ ان کے والد مولانا فضل امام مفتی اور صدر الصدور تھے۔ ان کے چچا مولوی محمد صالح سرکاری اخبار نویس تھے جبکہ ان کے بھائی فضل عظیم، ولیم فریزر کے معتمد خاص سہارنپور کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ خود مولانا ریذیڈنٹ دہلی کے ہاں سررشتہ دار اور حضور تحصیل لکھنؤ کے صدر الصدور رہے۔ ان کے فرزند مولانا عبدالحق کو گورنر جنرل

---

[1] امتیاز علی عرشی: "مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد۔" تحریک اگست ۱۹۵۷ء۔ ص، ۱۲۔

لارڈ ڈفرن نے شمس العلماء کا خطاب دیا اور انھوں نے حکومت انگریزی میں ہندوستان کو دار السلام قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں :

"بالجملہ در عہد سرکار دولتمدار انگلشیہ ملک ہندوستان از روئے روایات معتبرہ کتب فقہ بلا ریب دار السلام است۔ ہیچ گونہ دریں باب جائے اشتباہ ومحل شک نیست" لہ

حکومت انگریزی کو بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ مولانا کے مقدمہ میں سپیشل کمشنر نے اپنے فیصلہ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

" وہ اودھ کا باشندہ ہے اور ایک ایسے خاندان کا فرد ہے جو انگریزی حکومت کا ساختہ پرداختہ ہے، بلکہ ایک زمانے میں وہ خود بھی سرکاری ملازمت میں بڑے اچھے عہدے پر متمکن تھا۔"

مولانا فضل حق نے اس کی تائید کی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی درخواست بنام وزیر ہند میں لکھتے ہیں :

" جیسا کہ سپیشل کمشنر نے بھی اپنے فیصلے میں ذکر کیا ہے، میرا خاندان اپنی دنیوی حیثیت کے لیے بہت حد تک سرکار انگریزی کا مرہون منت ہے۔ ایک زمانے میں خود میں بھی انگریزی ملازمت میں بہت اچھے عہدے پر متمکن تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں انگریزی حکومت کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔"

لہ۔ روئداد اسلامی مجلس مذاکرہ علمیہ کلکتہ سال ہشتم (لکھنو: نولکشور) ص ۳۲۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاصر شہادتیں اور خود مولانا کی تحریریں، جنگِ آزادی میں ان کی شرکت کی نہ صرف توثیق نہیں کرتیں بلکہ ان کی شرکت کو مشکوک بنا دیتی ہیں۔ صرف ایک چیز جس نے انھیں جنگِ آزادی کا ہیرو بنا دیا، ان کی سزائے عمر قید تھی۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ان دنوں بہت سے بے گناہ اور وفادار شہریوں کو فوجی عدالتوں کی طرف سے یا تو گولی مار دینے یا شدید جسمانی اذیتوں کی سزائیں دی گئیں۔ اس سلسلے میں امام بخش صہبائی اور مولوی محمد باقر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ صہبائی دہلی کالج کے استاد تھے اور مولوی محمد باقر دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر سے نہایت دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ دونوں نے جنگِ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا، لیکن دونوں کو محض اس وجہ سے گولی مار دی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں چھپے ہوئے انگریز پناہ گزینوں کی جانیں نہ بچا سکے تھے۔

مولانا فضل حق خیرآبادیؒ

ایک تحقیقی مُطالعہ

افضل حق قرشی